زادِ عمل (۲)

حقائق اور غلط فہمیاں

جس میں اسلام اور شریعت اسلام سے متعلق ملکی
و عالمی سطح پر پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں
کا سنجیدہ جائزہ لیا گیا ہے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات
اور اس کی عقل و فطرت اور حکمت و مصلحت سے
ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

فہرست مضامین

پیش لفظ

۱۹۹۸ء سے روزنامہ منصف حیدرآباد ترقی اور خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ اور نئی انتظامیہ کے تحت شائع ہونے لگا، اس موقع سے اخبار کے منتظمین نے اس حقیر سے خواہش کی کہ ہر جمعہ کو خبر کے لئے ایک خصوصی کالم لکھا کروں اور اس کو "شمع فروزاں" کا عنوان دیا گیا، چوں کہ اخبار کی رسائی کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اور عوام و خواص، مرد و خواتین، چھوٹے اور بڑے سبھی اس سے استفادہ کرتے ہیں اور، اگر صحیح استعمال ہو تو یہ خیر کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف نے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔

چنانچہ شروع سے آج تک ہر جمعہ کو یہ کالم اس حقیر کے قلم سے ہوتا ہے، جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ پیش آنے والے نئے مسائل اور تازہ واقعات کے پس منظر میں اسلامی نقطۂ نظر کو صحیح پیرایہ میں رکھا جائے، تاکہ لوگ محسوس کریں کہ یہ ایک زندہ اور زندگی سے مربوط مذہب ہے، اس کالم کے تحت ان غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اسلام سے متعلق پیدا کی جارہی اور پھیلائی جارہی ہیں۔ عام لوگوں کی استعداد اور ان کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ان مضامین میں خالص علمی و تحقیقی انداز اختیار کرنے کے بجائے تذکیری اور جوابی رنگ کو غالب رکھا جاتا ہے اور اس رنگ میں کوشش کی جاتی ہے کہ علمی دلائل بھی آجائیں۔ چنانچہ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۰ء تک جو مضامین شائع ہوئے، ان میں سے اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ پر مبنی تحریروں کا یہ مجموعہ "حقائق اور غلط فہمیاں" اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہونے والے مضامین کو محفوظ رکھنے کا جو اہتمام ہونا چاہئے تھا، افسوس کہ نہیں ہوسکا اور بعض مضامین باوجود تلاش بسیار کے نہیں مل پائے، لیکن جو کچھ مضامین دستیاب ہوئے، اس کے لئے عزیزی مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی سلمہ شکریہ کے مستحق ہیں، انہوں نے بڑی محنت سے جن مضامین کی زیراکس کاپی محفوظ تھی، ان کو تاریخ کے لحاظ سے مرتب کیا، پھر جو مضامین نہیں مل سکے، ان کے لئے مختلف جگہ سے اخبارات جمع کرنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک مضامین کو اکٹھا بھی کرلیا، اس کے بعد چند ہی مضامین ہیں، جو حاصل نہیں کئے جاسکے، پھر انہوں نے ان مضامین کو موضوع کی مناسبت سے الگ

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ (ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کو اللہ تعالیٰ نے جہاں فقہ اسلامی میں مہارت اور شان امتیاز عطا کی ہے، وہیں احکام شریعت کی مصلحتوں اور فطرت انسانی اور عقل سلیم سے ان کی ہم آہنگی پر بھی ان کی گہری نظر ہے، اس لئے اپنی تحریرات کا مرکز ان غلط فہمیوں کو بھی بنایا اور اسلام کے خلاف پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں کا شریعت اسلامی اور انسانی عقل سلیم کے تناظر میں مثبت اور دلچسپ انداز میں جواب دیا ہے اور جہاد، تعدد ازدواج، پردہ، طلاق، حق میراث، ذبیحہ، غلام و لونڈی، تبدیلی مذہب جیسے اہم موضوعات — جن کے بارے میں عام طور پر غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں — پر مدلل اور بصیرت مندانہ گفتگو کی ہے، تقریباً چھ سالوں سے آپ ہندوستان کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ "منصف" حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن "مینارۂ نور" میں "شمع فروزاں" کے عنوان سے ہر ہفتہ ملکی، سیاسی، نئے مسائل اور اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں جیسے موضوعات پر ایک مضمون سپرد قلم کرتے ہیں، زبان و بیان کی سلاست و شگفتگی اور حقائق نیز عام فہم ہونے کی وجہ سے یہ مضامین عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہیں، اس لئے عام دنوں کے مقابلہ جمعہ ایڈیشن خاصی زیادہ تعداد میں شائع ہوتا ہے، یہ مجموعہ روزنامہ منصف میں شائع شدہ ان ہی مضامین کا گلدستہ ہے، احقر نے روزنامہ منصف کی فائلوں سے ان مضامین کو جمع کیا، جو یقیناً احقر کے لئے باعث سعادت ہے، جس سے عملی زندگی میں احقر نے بہت ہی فائدہ بھی محسوس کیا اور اب افادۂ عام کی غرض سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے، اس مجموعہ میں مولانا مدظلہ کا ۲۴ آیتوں والا رسالہ بھی شامل ہے، جو اصل میں وی۔ ایچ۔ پی والوں کی طرف سے قرآن مجید کی جن ۲۴ آیتوں کو نشانہ بنایا گیا ہے، اس کا جواب ہے، جو روزنامہ منصف میں ہی پہلی بار سات قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کا ہندی اور گجراتی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کا سبب بنے، اس کا نفع زیادہ سے زیادہ عام ہو اور یہ حقیر کوشش مصنف کتاب حضرت الاستاذ مدظلہ کے ساتھ ساتھ احقر کے لئے بھی ذخیرۂ آخرت بنے۔

۲۲/ رجب ۱۴۲۵ھ

محمد نعمت اللہ قاسمی

۸/ ستمبر ۲۰۰۴ء

(فاضل المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ!

حال ہی میں وی. ایچ. پی لیڈر گری راج کشور کا نہایت ہی مذموم، قابل مذمت اور اشتعال انگیز بیان آیا ہے کہ قرآن و حدیث کے مضامین میں تبدیلی ہونی چاہئے اور بقول ان کے جن آیات و احادیث میں غیر مسلموں سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہے ان کو نکال دینا چاہئے، یہ بیان نامعقول بھی ہے، اور ناشائستہ بھی، ناشائستہ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے مذہبی ماخذ پر حملہ کرنے کے مترادف ہے، نامعقول اس لئے کہ کسی بھی تحریر و بیان میں صاحب تحریر ہی کو تبدیلی کا حق حاصل ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کوئی بات کہے، اور دوسرا شخص اس بات کو بدل لے لے، اس سے قطع نظر کہ مسلمان قرآن کو اللہ کا کلام اور حدیث کو وحی ربانی کا بیان سمجھتے ہیں، خالص عقلی نقطہ نظر سے بھی یہ نہایت ہی نامعقول بات ہوگی، لیکن اس قسم کے غیر دانشمندانہ خیالات مسلمانوں کے لئے کوئی اچنبھے کی چیز نہیں ہیں۔

جس عہد میں قرآن مجید نازل ہوا، اس وقت بھی مشرکین نے یہی مطالبہ کیا تھا، اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی یہی جواب دلوایا گیا تھا کہ ہماری کیا مجال کہ ہم قرآن کو بدل دیں یا ہم اپنی طرف سے کوئی بات لے آئیں، ارشاد ہے:

> جب ان پر ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے، جو واضح ہیں تو جن لوگوں کو (آخرت میں) ہماری ملاقات کا یقین نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اس میں تبدیلی کر دو، آپ فرما دیں: مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں؟ میں تو صرف ان احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، اگر

میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (یونس ۱۵)

غور کیجئے! کہ آج کل کے لوگوں نے جو مطالبہ کیا ہے، وہ کس قدر مشرکین مکہ کے مطالبہ کے مطابق ہے، زمانہ مختلف ہے، سب و لہجہ میں فرق ہے، زبان و بیان کا اختلاف ہے، لیکن فکر و نظر اور قلب و ذہن کے فساد میں یکسانیت ہے: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ (البقرۃ ۱۱۸) اور ظاہر ہے کہ آج بھی اہلِ اسلام اس کا وہی جواب دیں گے، جو اُس کے پیغمبر نے دیا تھا کہ یہ ہماری تصنیف یا ہمارے خیالات نہیں ہیں، بلکہ یہ احکام خداوندی ہیں، ہماری مجال نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی کریں، اگر ہم نے اس میں ایک نقطہ کی تبدیلی بھی گوارا کی، تو آخرت کے عذاب سے نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

اور یہ کچھ مشرکین مکہ ہی پر موقوف نہیں، بلکہ ہر عہد میں گمراہ، خدا بیزار اور حقیقت ناشناس لوگ ایسی نامعقول اور ناشائستہ باتیں کہتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قوم بنی اسرائیل کا واقعہ تو واضح طور پر ذکر کیا ہے، کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے تورات لے کر آئے تو یہود (جن کی پوری تاریخ اللہ کے احکام سے سرکشی و سرتابی، انبیاء و رسل کے ساتھ استہزاء و تمسخر، ایذا رسانی و قتل، ظلم اور جور سے عبارت ہے) نے اس کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا، ان کا مطالبہ تھا کہ اسے آسان کیا جائے اور اس میں جو سخت احکام آئے ہیں، انہیں بدل دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سرکشی کو دیکھتے ہوئے ان پر کوہ طور کو اٹھا لیا، اور ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو احکام دیئے ہیں انہیں مضبوطی سے تھامو، اور اسے یاد رکھو، ورنہ اس پہاڑ کے نیچے پیس دیئے جاؤ گے "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ، خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" (البقرۃ ۶۳) تب جا کر انہوں نے سر تسلیم خم کیا اور احکام الٰہی کو قبول کیا۔

انسان چونکہ خود فانی ہے، اس کے خیالات و افکار بھی فانی اور ناپائیدار ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرہ ذرہ سے باخبر اور ساری کائنات کا خالق

رہ کلک ہے اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل برابر ہے، اس کا کوئی حکم عدل کے خلاف اور واقعہ کے مغائر نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کا کوئی قانون توازن اور اعتدال سے خالی ہو سکتا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی کی بات سوچنا بھی بے وقوفی اور بے دانشی ہے، قرآن نے اس بات کو بہت واضح طور پر کہا ہے۔

> آپ کے رب کی بات پوری ہوگئی، سچائی اور عدل کے اعتبار سے۔
> کوئی نہیں جو اس کے احکام کو بدل دے، وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے،
> جو لوگ زمین میں ہیں، اگر آپ ان کی اکثریت کی بات ماننے لگیں تو وہ
> تو آپ کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے، وہ تو محض گمان کی پیروی کرتے
> ہیں، اور محض اٹکل لگاتے ہیں۔ (انعام: ۱۱۵، ۱۱۶)

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی زبان سے کہلایا کہ کیا اللہ کے سوا میں کسی اور عالم کو حکم تسلیم کر سکتا ہوں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر تفصیلی کتاب اتاری ہے "أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا" (الانعام: ۱۱۴) یعنی یہ ایسا پاک خواب ہے جو قیامت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا؟

یہ سمجھنا کہ قرآن وحدیث میں نفرت کی تعلیم دی گئی ہے، کھلا ہوا بہتان اور اتہام ہے۔ قرآن انسانوں سے نفرت نہیں بلکہ محبت سکھاتا ہے، قرآن اس بات سے منع کرتا ہے کہ انسانوں کا کوئی طبقہ دوسرے انسانوں کو ذلیل و حقیر سمجھے، قرآن کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام پوری انسانیت کے باپ ہیں، اور آدم و حواء سے تمام انسان پیدا ہوئے ہیں، یہ انسانی وحدت کا تصور جہاں مساوات کی بنیاد فراہم کرتا ہے، وہیں ایک خاندان اور ایک کنبہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے انس و محبت کا درس بھی سکھاتا ہے، قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم میں فرق کئے بغیر کسی بھی نفس انسانی کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا "مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا" (المائدہ: ۳۲) اگر اسلام نے غیر مسلموں سے نفرت کی تعلیم دی ہوتی تو یہ بھی کہا ہوتا کہ مسلمان دوسری قوموں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں، لیکن قرآن نے صاف اعلان کیا

کہ مذہب کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر روا رکھنا درست نہیں۔ "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ" (البقرۃ: ۲۵۶)

اسلام تو امن و امان اور صلح و آشتی کا مذہب ہے، اور قرآن و حدیث میں قدم قدم پر اس کی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو غیر مسلم مصالحانہ رویہ اختیار کریں، اور تمہارے ساتھ صلح و آشتی کی زندگی گذارنا چاہیں، تم بھی ان کے ساتھ صلح کا راستہ اختیار کرو: "وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" (الانفال: ۶۱)

قرآن نے مسلمانوں سے برسرِ پیکار غیر مسلموں سے مقابلہ کی تلقین کرتے ہوئے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جن سے مسلمانوں کا صلح و امن کا معاہدہ ہو، چنانچہ ارشاد ہے

ان لوگوں سے قتال نہ کرو جو ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو، یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں اور نہ اپنی قوم سے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط فرما دیتا، پھر وہ تم سے جنگ کرتے، اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے گریزاں ہیں، اور تم سے صلح چاہتے ہیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان کے خلاف جنگ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ (النساء: ۹۰)

کتنا واضح حکم ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں، ان کے حقوق کے غاصب نہ ہوں، اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کی راہ اختیار نہ کرتے ہوں، ان سے نہ جنگ و جدال کی اجازت ہے، اور نہ نفرت و بیگانگی کی گنجائش، ہاں! جو لوگ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے درپے ہوں، اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی سوداگری کرتے ہوں، ان سے یقیناً جہاد کا حکم دیا گیا ہے، یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے، بلکہ دنیا کے تمام مہذب قوانین میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے بنیادی حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

شری راج کشور کے بیان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں نہ صرف اسلام کی بلکہ ہندو مذہب کی بھی توہین کی ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر اس بات کو

قرآن مجید اور دہشت گردی

قرآن مجید جس عہد اور جس سماج میں نازل ہوا، اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو لاقانونیت، بدامنی اور بدکرداری تھی۔ اس لاقانونیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں باضابطہ کسی حکومت کا وجود نہیں تھا، عرب کے گرد و پیش جو حکومتیں قائم تھیں، وہ نسلی برتری اور کمتری پر یقین رکھتی تھیں اور جو انسانی سماج پیدائشی عظمت اور تحقیر کے تصور پر قائم ہو، ظاہر ہے کہ وہاں عدل و انصاف کا قائم ہونا ممکن نہیں۔ ایسے ماحول میں اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا، اس کتاب میں جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی اس میں علم اور قلم کی اہمیت کو بتایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ تمام انسان کا مادۂ تخلیق ایک ہی ہے۔ اس میں انسانی وحدت کی طرف اشارہ تھا۔ علم انسان کو قانون کا پابند بناتا ہے اور انسانی مساوات کے تصور سے عدل کا جذبہ ابھرتا ہے اور تکریم انسانیت کا عقیدہ پروان چڑھتا ہے، اسی لئے ایک ایسا ملک جو امن و امان سے یکسر محروم تھا اور جہاں ظلم و جور اور دہشت گردی نے قانون کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اسلام نے اس کو امن و سلامتی سے ہمکنار کیا، انسانی اخوت کا سبق پڑھایا، اور رسول اللہ ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ ایک خاتون تنہا اونٹنی پر سوار ہو کر صنعاء یمن سے شام تک کا سفر کرے گی۔

اس نے اپنے متبعین کے لئے دو ایسی تعبیرات اختیار کیں جن کے معنی ہی "امن، امان" اور "صلح و سلامتی" کے ہیں، یعنی "مومن" اور "مسلم"، مومن کے معنی امن دینے والے کے ہے اور مسلم کے معنی صلح اور دوسروں کی سلامتی کا لحاظ رکھنے والے کے، اس کتاب کی ابتداء بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ اور آپ بندوں کے مہربان ہونے کا ذکر ہے اور پہلی سورہ کی پہلی آیت میں ہی خدا کو تمام کائنات کا

رب" قرار دیا گیا ہے، رب کہ جو بے پناہ شفقت اور محبت کا مظاہرہ کرتا ہے اور تمام عالم کا رب
کہہ کر پوری نوع انسانیت کو رشتۂ اخوت میں باندھ دیا گیا ہے، اور نسلی فوقیت کا تصور رد کیا
ہے کہ جس میں پوری انسانیت ایک کنبہ اور ایک خاندان کا درجہ رکھتی ہے۔ غرض کہ قرآن
مجید اس وقت انسانی اخوت اور آفاقیت کا علمبردار ہے، لیکن بدقسمتی سے موضوع پر تصور کے
کی کوشش کی جا رہی ہے، اور بعض تنگ نظر حضرات یہ کہنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ قرآن
مجید میں کچھ نقص ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کے پڑھنے والوں میں دہشت گردی کا
رجحان پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک بہتان تراشی ہے کہ کوئی ایسا شخص جس نے سرسری طور بھی
قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہوگا وہ ہرگز اس سے متاثر نہیں ہو سکتا، کہ یہ دین کرامت اور شرف کو
ختم کرنے کے مترادف ہے۔

عربی زبان میں دہشت گردی کو "ارھاب" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن
نے مسلمانوں کو یقیناً اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ان کے پاس ایسی طاقت موجود رہنی
چاہئے کہ ان کے دشمنوں کو ظلم و جور کے ارتکاب کی ہمت نہ ہو، اور وہ مرعوب رہیں۔ اسی کو
قرآن نے "قوت مرہبہ" سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا
تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ"۔ (الانفال ۶۰)

ان کے لئے جس قدر ممکن ہو طاقت اور گھوڑے تیار کر کے رکھو،
تاکہ تم اس کے ذریعہ اللہ اور اپنے دشمن اور دوسرے لوگ جنہیں تم نہیں
جانتے لیکن اللہ انہیں جانتا ہے، مرعوب رکھ سکو۔

قرآن کے اس بیان سے واضح ہے کہ طاقت دشمنوں کو مرعوب رکھنے اور ان کو ظلم
و جور سے باز رکھنے کے لئے ہے، نہ کہ بے قصور لوگوں کو نشانہ بنانے اور تباہی و بربادی
پھیلانے کے لئے۔

قرآن کے احکام جہاد سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ وہ بے قصور کسی بھی غیر مسلم پر

ہیں، زیادہ تر دہشت گردی کا سبب یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ دوسروں کو جبراً اپنے مذہب و عقیدہ کا تابع بنانا چاہتے ہیں، عیسائیوں کی مذہبی تاریخ اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، قرآن نے صاف اعلان کر دیا کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے: "لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرۃ: ۲۵۶) اسی لئے اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ کوئی گروہ دوسروں کے مذہبی مقتداؤں اور پیشواؤں کو برا بھلا کہے، کیوں کہ اس سے جذبات مشتعل ہوتے ہیں:

"وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (الانعام: ۱۰۷)

کسی معاشرہ میں دہشت گردی کے پیچھے کا اصل سبب ظلم و ناانصافی ہے، جو گروہ مظلوم ہوتا ہے، اگر وہ ظالم کا مقابلہ نہیں کر پاتا ہے، اور انصاف کے حصول سے محروم رہتا ہے تو اس میں منتقمانہ جذبات پرورش پاتے ہیں، اور جب وہ دیکھتا ہے کہ قانونی راستے بند ہیں، تو غیر قانونی راستہ اختیار کر لیتا ہے، اس لئے دہشت گردی کو روکنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ظلم و جور کا دروازہ بند کیا جائے، اور عدل و انصاف کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ نافذ کیا جائے، تاکہ دہشت گردی پر ابھارنے والے عوامل ہی ختم ہو جائیں، اسی لئے قرآن نے جگہ جگہ عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کی بڑی تاکید کی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" (النحل: ۹۰)۔ قرآن نے تاکید کی ہے کہ کسی قوم سے عداوت بھی تم کو اس کے ساتھ ظلم و ناانصافی پر کمربستہ نہ کر دے، اور جادۂ عدل سے ہٹنے نہ پائے۔ (المائدہ: ۸)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت شدت کے ساتھ دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، حالانکہ خود مسلمان ملکی اور عالمی دہشت گردی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں مسلمانوں کی حالتِ زار ناقابل بیان ہے، مسلمان اگر اپنے ملک میں بھی خود اپنی خواہش اور مرضی سے اسلامی نظام حیات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو ان کو تہذیبی تصادم اور شدت پسندی کا نام دے کر مداخلت کی راہ ہموار کی جاتی ہے، اور ان سے وہی کچھ کہا جاتا ہے، جو انبیاء کی اقوام ان سے کہا کرتی تھیں، مثلاً حضرت شعیب اور ان کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا

(الاعراف: ۸۸)

حضرت شعیب کی قوم میں سے تکبر پر آمادہ گروہ نے کہا کہ اے شعیب! ہم تجھ کو اور تیرے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے شہر سے نکال کر ہی رہیں گے، یا تو تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔

آج ہندوستان میں فرقہ پرستوں کی طرف سے نعرہ لگایا جاتا ہے "کہاں جائے گا مسلمان؟ پاکستان یا قبرستان!" حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا کیا یہ نعرہ اس سے مختلف ہے؟ قریب قریب یہی صورتحال مسلمانوں کے ساتھ دنیا کے مختلف علاقوں میں ہے، اعداء اسلام اور طاغوتی طاقتیں اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتیں جب تک مسلمان اپنے ایمان و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت سے دستبردار نہ ہو جائیں، اور ظاہر ہے کہ اصحاب ایمان کے لئے یہ قطعاً ناقابل قبول ہے، قرآن نے یہود و نصاریٰ کی نفسیات اور اسلام کے تئیں ان کے بغض و عداوت اور مزاج و مذاق کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ

(البقرۃ: ۱۲۰)

یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں۔

آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف اصل ناراضگی اسی کی ہے کہ یہ مغرب کی مادر پدر آزاد ثقافت کے سامنے سرنگوں کیوں نہیں ہوتے؟ یہ اخلاقی اقدار اور شرم و حیاء کے علمبردار کیوں بنے پھرتے ہیں؟ مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ ان مشکل حالات میں صبر و استقامت سے کام لیں، اور مغرب و مشرق کی مشترکہ دہشت گردی اور انسانیت سوزی سے خوف زدہ نہ ہوں کہ یہ ایک آندھی ہے جو گذر جائے گی، اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ کی

استقامت کا کیا خوب ذکر فرمایا ہے کہ انھیں جس قدر ڈرایا جاتا اسی قدر ان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا جاتا تھا:

> اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا ۔ (آل عمران ۱۷۳)
>
> صحابہ سے لوگوں نے کہا کہ (مخالفین نے) بہت سارے لوگ تمہارے مقابلہ میں جمع کر لئے ہیں، تم ان سے ڈرو، تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہی ہوگیا۔

ایمان کی علامت یہی ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کی راہ میں جس قدر ابتلائیں اور آزمائشیں آئیں، دشمنوں کے طوفان اٹھیں، مخالفتوں کی لہریں موجزن ہوں، خوف و دہشت کا ماحول پیدا کیا جائے، حوصلہ شکن حالات کا سامنا ہو، اسی قدر ان کی ہمتیں بلند ہوتی جائیں، ان کے حوصلے ٹوٹنے نہ پائیں، اور مخلوق کا خوف ان پر غالب نہ ہونے پائے، اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا جو پروپگنڈہ ہورہا ہے، یہاں تک کہ قرآن جیسی عظیم کتاب کو بھی نشانۂ تنقید بنایا جارہا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان ہمت ہار جائیں، وہ مغرب کی ریشہ دوانیوں کی سامنے سرنگوں ہوجائیں، اور اسلام کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہوکر رہ جائیں، پس ان حالات میں مسلمانوں کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا اور صبر و استقامت کی راہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء)

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ امت مسلمہ اپنی بہت سی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود آج بھی اپنے مذہب سے مربوط ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں سینکڑوں دار الافتاء ہیں، جن کے پاس روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں فتاویٰ کی ڈاک آتی ہے، اور لوگ زندگی کے نوع بنوع مسائل کے بارے میں حکم شرعی دریافت کرتے ہیں، کسی جبر و دباؤ کے بغیر اپنے سینکڑوں نزاعات کو شرعی پنچایت اور دار القضاء ہی میں لے جاتے ہیں اور مسلمان چاہے زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہو، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی زندگی گذارے، اسی چیز نے اسے الحاد و بے دینی کے اس طوفان میں بھی دین سے مربوط رکھا ہے اور وہ اس لادینی ثقافت کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں ہیں جس کے سامنے آج تمام قومیں اپنی شکست تسلیم کرچکی ہیں، یہ سب قرآن مجید کا فیض ہے، یہی وہ چیز ہے جس نے حق اور سچائی کے دشمنوں کو قرآن مجید کے خلاف کھڑا کردیا ہے، لیکن یہ بات کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ حذف کردیا جائے، کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ مطالبہ تو خود نزول قرآن کے زمانہ میں بھی رہا، لیکن جیسے ان معاندین کی خواہش ناکام و نامراد ہوئی، آج جو لوگ قرآن مجید کے خلاف زبان کھول کر سورج پر تھوکنے کی کوشش کررہے ہیں، ان کی اس بے جا خواہش اور مطالبہ کا بھی وہی حشر ہوگا۔

ہندوستان میں حقیقت پسند ہندو علماء نے ہمیشہ قرآن مجید کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا ہے۔ گاندھی جی اور ونوبا بھاوے مذہبی شخصیت کے حامل تھے۔ گاندھی جی قرآن مجید سے بہت متاثر تھے اور اس کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے، یہی حال ونوبا جی کا تھا، انہوں نے تو قرآن کی منتخب آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بھی "روح القرآن" کے نام سے مرتب کی ہے، ہندوستان میں طباعت و اشاعت کی موجودہ سہولتوں اور پریس کی کثرت کے دور سے پہلے قرآن مجید کی طباعت میں سب سے نمایاں کام "منشی نول کشور لکھنؤ" کا ہے، وہ صحت کے مکمل اہتمام کے ساتھ قرآن مجید طبع کیا کرتے تھے اور طباعت کے لئے تختیاں تیار کرتے تھے، نیز انہیں احتراماً دوسری زیر طباعت کتابوں اور ان کی تختیوں سے اوپر رکھا کرتے تھے، یہ ان ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کرچکے تھے۔

قرآن مجید کے بارے میں ہندو علماء کے تاثرات

قرآن مجید کے بارے میں بابا بھوپندر ناتھ باسو فرماتے ہیں:

تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیم کا یہ اثر موجود ہے کہ ایک خاک روب بھی مسلمان ہونے کے بعد بڑے بڑے خاندانی مسلمانوں کی برابری کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

بابو بپن چندر پال کہتے ہیں:

قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا امتیاز موجود نہیں ہے، نہ کسی کو محض خاندانی اور مالی عظمت کی بنا پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔

مشہور قائد مسز سروجنی نائیڈو کا یہ بیان کس قدر حقیقت پسندانہ ہے کہ:

قرآن کریم غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے، وہ تو اس کی پیروی سے خوش حال ہو سکتی ہے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کا ارشاد ہے:

مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کرنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے۔

(سہ روزہ دعوت ۱۳ مئی ۱۹۸۸ء ص ۲)

قرآن مجید کے ہندو مترجمین و ناشرین

قرآن مجید سے اسی تعلق اور عقیدت کا اثر ہے کہ مختلف ہندو اہل علم نے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یا قرآن کی منتخب آیات کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ ونوبا بھاوے کی "روح القرآن" کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر بھارتیندو ہریش چندر نے بھی قرآن کا ترجمہ شروع کیا تھا، جو رسالہ ہریش چندر میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ لکھنؤ کے نند کمار اوستھی نے بھی قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ آریہ سماجیوں کی طرف سے بھی وید کے منتروں سے تقابل کرتے ہوئے قرآنی آیات کا انتخاب مع ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں ہندوستان کے سابق کیبنٹ سکریٹری ونود چند پانڈے نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا ہے، انہیں اعتراف ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے بلکہ وحی ہے۔ سردار مکھیت سنگھ کی فرمائش پر کنہیا لال گکھمدری نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا، جو چار

سو چودہ صفحات پر دھرم پرچار سبھا لدھیانہ سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ترجمہ میں شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔

بنگال کے ایک ہندو عالم گریش چندر سین نے ۱۸۸۱ء میں قرآن مجید کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۲۶ء میں بنگال کے رہنے والے مسلم علماء نے اس ترجمہ کو مستند قرار دیا۔ پنڈت کیلاش چندر برہسپت نے جناب ناصر الدین راجگری کے ساتھ مل کر مولانا صدر الدین اصلاحی مرحوم کے ترجمہ کو ہندی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ ۱۹۵۵ء میں رامپور سے شائع ہوا، اور اس کے صرف دو ہی پارے منظر عام پر آسکے، جناب پران ناتھ نے اپنی گجراتی تالیف "قلزم سروپ" میں قرآن، اور وید کے متون کا انتخاب پیش کیا ہے۔ جس پرکاش ایڈووکیٹ سپریم کورٹ دہلی نے قرآن مجید کا منظوم ہندی ترجمہ "پوتر قرآن درشن" کے نام سے کیا ہے، جسے "الوک پرکاش" نے شائع کیا ہے اور فروری ۲۰۰۰ء کے کتابی میلہ میں اسے نمائش وفروخت کے لئے بھی رکھا گیا تھا، شیخ محمد یوسف کا ہندی ترجمہ قرآن جس شخصیت نے شائع کیا، وہ تھیں پنڈت دولت رام شرما، یہ ترجمہ اسناد پریس بازار بانس امرتسر سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔

(ملخص از دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کا حصہ ص ۱۵۸_۱۵۵)

یہ ان ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

اب یہ بے چارے وی ایچ پی والے جو سیاست کے لیے مذہب اور دھرم کا ناجائز استعمال کرتے رہے ہیں اور اپنی زہر آلود تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ انسانوں کو بانٹنے اور دلوں کو تقسیم کرنے کا کام کر رہے ہیں، ان ہی لوگوں نے سیدھے سادے، سادہ لوح ہندو بھائیوں کے دلوں میں نفرت کی بیج بونے اور مسلمانوں کے خلاف تشدد پیدا کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی ۲۴ آیتوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کے ذریعہ بتانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ قرآن کریم غیر مسلموں کو قتل کرنے، ان کا دشمن رہنے اور انہیں دوست نہ بنانے کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے مسلمان کبھی بھی غیر مسلموں کے حق میں مہربان اور رحم دل نہیں ہو سکتے۔

اس پروپیگنڈے کی حقیقت یہ ہے کہ انھیں آگے پیچھے کے مضمون سے کاٹ کر یا جن غیر مسلموں سے عہد نبوت کے مسلمانوں کا سابقہ تھا، ان کو نظر انداز کر کے اور ان آیات کے نازل ہونے کے پس منظر کو بیان کیے بغیر پیش کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی بات کو اگر اس کے پس منظر سے جدا کیا جائے، یا اس کو آگے یا پیچھے کی عبارتوں سے کاٹ کر پیش کیا جانے لگے تو اچھی سے اچھی بات کا بھی غلط مفہوم نکالا جا سکتا ہے۔ اسی پس منظر میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان آیات کے بارے میں صحیح صورت حال پیش کر دی جائے۔

بحیثیت مجموعی یہ آیات تین طرح کی ہیں: دس آیات جہاد سے متعلق ہیں، چھ آیات غیر مسلموں سے تعلق دوستی رکھنے نہ رکھنے اور ان کے دوستی کے لائق ہونے اور نہ ہونے سے متعلق ہیں اور آٹھ آیتیں غیر مسلموں پر عذاب سے متعلق ہیں۔ جن آیات کو زیادہ تر پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا گیا ہے، وہ جہاد سے متعلق آیتیں ہیں، اس لیے پہلے ان ہی آیات پر گفتگو کی جاتی ہے

جہاد سے متعلق آیات

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا

(النساء ۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ کفر کر رہے ہیں تم بھی کفر کرو، تاکہ تم ایک جیسے ہو جاؤ، تو تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کر جائیں، اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں تو انھیں جہاں کہیں پاؤ پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت اہل مکہ نے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچائی تھی، یہاں تک کہ ان کے قتل کے درپے ہو گئے تو مسلمانوں کو مجبور ہو کر مکے سے نکل

کرنا پڑا اور انہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی، پھر یہاں بھی مسلمانوں کا چین و سکون انہیں پسند نہیں آیا اور انہوں نے بار بار مدینہ پر اپنی یلغار جاری رکھی، ظاہر ہے جو لوگ مسلمانوں کی جان کے درپے ہیں تو اپنی مدافعت کے طور پر وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل تھا کہ وہ ان کی زیادتیوں کا جواب دیں، اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے تبدیلیٔ مذہب اور ارتداد سے کم کسی اور بات پر راضی نہیں تھے، جو ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ظلم ہے۔

پھر اس سے اگلی آیت کو دیکھا جائے تو بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ إِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ أَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ أَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوْكُمْ فَإِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (نساء: ۹۰)

سوائے ایسے لوگوں کے جو ان سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان عہد (معاہدۂ امن) ہو، یا وہ تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں نہ اپنی قوم سے، حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا، پھر وہ تم لوگوں سے جنگ کرتے، تو اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں جنگ نہ کریں اور صلح پیش کریں، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

دیکھئے! اس آیت نے اس بات کو واضح کر دیا کہ اس سے پہلی آیت میں قتال کا حکم ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہوں، جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں یا مسلمانوں کے حلیف کسی غیر مسلم گروہ کے حلیف ہوں، یا غیر جانبدار ہوں، نہ مسلمانوں سے جنگ چاہتے ہوں اور نہ ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے جنگ کی حالت

میں ہوں تو ان تینوں طرح کے لوگوں سے مسلمانوں کے لیے قتال درست نہیں، بلکہ قرآن نے صاف طریقہ پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ صلح وامن کا رویہ اختیار کریں، مسلمانوں کو ضروری ہے کہ ان کے اس رویہ کا جواب صلح اور امن سے دینا چاہیے اور کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

دوسری آیت

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ. (انفال - ۶۵)

اے نبی! ایمان والوں کو قتال پر آمادہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو ایک ہزار منکرین پر بھاری رہیں گے؛ کیوں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی، بلکہ یہ پوری سورت ہی زیادہ تر غزوۂ بدر کے واقعات اور اس سے متعلق شرعی احکام پر مشتمل ہے۔ غزوۂ بدر ان حالات میں ہوئی کہ مسلمان ظلماً مکہ سے نکال دیے گئے تھے، بہت سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے قریب ترین افراد کو جبراً مکہ میں روک لیا گیا تھا، اہل مکہ کے مقابلہ مسلمان تعداد میں بھی کم تھے، اسلحہ اور دوسرے وسائل کے اعتبار سے بھی مکہ کے حملہ آوروں کا پلڑا بھاری تھا، اس پس منظر میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی تعداد کی کمی پر نظر نہ رکھیں، بلکہ اپنے مقصد پر نگاہ رکھیں کہ مکہ کے لوگ تو بن سمجھے بوجھے محض انا کے لیے حملہ آور ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ایک خاص مشن کے تحت ہے، اس لیے اگر تم کم بھی ہو تو زیادہ لوگوں پر غالب آسکتے ہو۔ اب غور کیجئے، کہ اس میں کن غیر مسلموں سے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے؟ ان غیر مسلموں کے خلاف جو حملہ کرنے والے تھے، ظالم کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کر رہے تھے اور ان کے جان و مال

کے در پے تھے، مگر مسلمانوں کی طرف سے پہل ہوئی تو یہ جنگ بدر کے بجائے (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) مکہ کے قریب ہوئی ہوتی۔ تو کیا حملہ آوروں کے لئے مقابلے پر ایسا کوئی ناروا بات ہے؟ اگر ہمارے ملک پر دشمن حملہ آور ہوں تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہوگا کہ ہم اہل وطن کو ان سے مقابلے کی ترغیب دیں۔ غور کیجئے کہ ظلم کرنا مذموم ہے یا ظلم کا جواب دینا۔ یہ اتنی بات ہے جسے معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔

تیسری آیت

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (التوبہ۔ ۵)

جب حرمت والے مہینے گزر جائیں، تو تم ان مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، انہیں پکڑو، گھیرو، اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر یہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ معاف کرنے والے مہربان ہیں۔

اس آیت کے مضمون ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ان اہل مکہ کے بارے میں ہے جو حرام مہینوں کا احترام کرتے تھے، جو بہت سے مسلمانوں کے قاتل تھے، بہت سے مہاجرین کے رشتہ داروں کو انہوں نے روک رکھا تھا، جہاں کہیں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ آجاتا تھا اسے گرفتار کر لیتے تھے اور اسے قتل کرکے یا قاتلوں کے ہاتھ بیچ کر اس کے دام لیتے تھے، اسی سلسلہ میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ بہت مشہور ہے، جنہیں گرفتار کرکے اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کیا گیا اور انہوں نے غزوۂ بدر میں ہلاک ہونے والے اپنے مورث کے بدلے نہایت بے دردی اور سفاکی کے ساتھ انہیں شہید کر دیا، انہی مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم بھی ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لے سکتے ہو۔

اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد جو آیتیں آرہی ہیں، اگر انہیں پڑھ لیا جائے تو

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مشرکین کا ایک خاص گروہ مراد ہے نہ کہ تمام مشرکین، چنانچہ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ. (التوبہ:۱۳)

کیا تم ایسے لوگوں سے قتال نہیں کرو گے جنہوں نے اپنے عہد توڑ دیے، رسول کو جلا وطن کرنے کی ٹھان لی اور انہوں نے تمہارے مقابلہ میں خود ہی پہل کی ہے؟ کیا تم لوگ ان سے ڈرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ زیادہ اس لائق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

اس آیت نے بات صاف کر دی کہ پہلے جن مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی، مسلمانوں کو وطن سے بے وطن کرنے پر کمربستہ رہے اور نقصان پہنچانے اور حملہ کرنے میں پہل کی، چنانچہ علامہ آلوسیؒ نے اوپر (آیت نمبر:۵) میں جن مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ان کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ اس سے یہی عہد شکنی کرنے والے مشرکین مراد ہیں۔ المـــراد من المشركين الناكثون ۔ (روح المعانی: ۱۰/۴۷) ___ پھر سورۂ توبہ کی اس دوسری آیت (آیت نمبر:۱۳) نے اس بات کو واضح کر دیا کہ قرآن نے بطور جواب اور مدافعت کے مشرکین سے قتال کی بات کہی ہے؛ کیوں کہ پہل ان ہی کی طرف سے تھی، یہ آیت اور آگے آنے والی آیت بھی دراصل فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، مشرکین مکہ نے ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے اولاً تو مسلمانوں کو ان کے وطن مکہ سے نکالا، پھر متعدد جنگیں ان پر مسلط کیں، ہجرت کے پہلے سال غزوۂ بدر، دوسرے سال غزوۂ احد اور پانچویں سال غزوۂ خندق کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ سے بھی اجاڑ دیا جائے، پھر ہجرت کے چھٹے سال انہی کی شرائط پر صلح حدیبیہ ہوئی اور ایک ڈیڑھ سال کے اندر انہوں نے اس صلح کی بھی دھجی اڑا دی ___ اب بتائیے کہ ایسے لوگوں کے خلاف اگر مزاحمت کی دعوت نہ دی جائے تو کیا ان

کے بارے میں بھی مسلمانوں کی تنگ نظری کو کیا کہا جائے گا؟

چوتھی آیت

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ (التوبہ:۱۴)

''ان سے قتال کرو، اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا اور رسوا کرے گا، تمہاری ان کے مقابلہ میں مدد کرے گا اور مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔''

یہ سورۂ توبہ کی ۱۴ ویں آیت ہے کہ جس سے پہلے ان مشرکین کا ذکر ہے، جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کے مرتکب ہوئے تھے، انہیں کے بارے میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا اور تمہاری مدد کرے گا، اور اہل مکہ کی زیادتی کی وجہ سے تمہیں جو دکھ پہنچا ہے — اور ظلم پر آدمی کا آزردہ خاطر ہونا ایک فطری چیز ہے — تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ میں تمہارے لیے تسکین خاطر کا سامان کرے گا، ظاہر ہے کہ اس آیت میں ظالموں سے بدلہ لینے کا ذکر ہے، جو عین مطابق انصاف ہے۔

مشہور مفسر امام مجاہدؒ نے نقل کیا ہے کہ اس آیت کا تعلق بنو بکر اور بنو خزاعہ کی لڑائی سے ہے، یہ دونوں ہی قبیلے مشرک تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ بنو بکر اہل مکہ کے حلیف تھے اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے، جب صلح حدیبیہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ناجنگ معاہدہ ہوا تو اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اہل مکہ اور مسلمانوں کے حلیف قبائل پر بھی اس کا اطلاق ہوگا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی زیادتی نہیں کریں گے، لیکن ہوا یوں کہ بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا، یہاں تک کہ حرم تک جہاں اسلام سے پہلے بھی لوگ اپنے جانی دشمنوں اور اعزہ و اقرباء کے قاتلوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، بنو خزاعہ کے لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور اس عہد شکنی میں اہل مکہ بھی پوری طرح شریک و شامل رہے۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے

ذریعہ تم ان بدعہدی کرنے والوں پر غالب ہوئے اور ان کے ظلم و زیادتی کی وجہ سے فطری طور پر جو آتش انتقام تمہارے سینہ میں بھڑک رہی ہے، اللہ اسے بجھائیں گے اور تمہارے دلوں کو ٹھنڈا کریں گے۔ (دیکھیے تفسیر قرطبی ۸۸،۸۵،۸)

اب غور کیجیے کہ جن لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہو اور خود ہی حملہ کرنے میں پہل بھی کی ہو، کیا ان کے خلاف جوابی کاروائی کرنا ناانصافی کی بات ہے اور کیا قرآن کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم اپنا اور اپنے حلیفوں کا قتل عام دیکھتے رہو، مگر ہاتھ پر ہاتھ دیے بیٹھے رہو اور اپنی طرف سے کوئی جواب نہ دو؟؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے جو ظالموں کے مقابلہ خدا کی طرف سے مظلوموں کی مدد کی بات کی ہے، یہ کوئی عجوبہ نہیں، بلکہ ہر مذہب میں حق اور سچائی پر قائم رہنے والوں کو اہل باطل اور ظالموں کے مقابلہ خداوندی فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی گئی ہے، مثلاً رگ وید میں خدا سے اس طرح دعائیں کی جاتی ہیں:

☆ اے روشن آگ! تو جس پر گھی کا تیل ڈالا جاتا ہے، ہمارے دشمنوں کو جلا دے، جن کی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں۔ (۱/۱۲، ۵)

☆ تو آریوں اور دسیوؤں کے درمیان امتیاز کر جو ادھرمی ہیں، ان کو سزا دے اور انھیں اس کے حوالے کر دے جس کی گھاس (دیوتاؤں کے نذرانے کے لیے) کی رکھی ہے۔" (۸: ۵۱: ۱)

☆ پس اے اندر! ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا کر، ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں کو مغلوب کرے، ہمارے دولت مند سرداروں کو برقرار رکھ، ہمارے راجاؤں کی حفاظت کر، ہم کو دولت اور خوراک شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔" (۱۱: ۵۳/۱)

بائبل نے مشرکین کی نسبت سے جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے، اسے ان اقتباسات میں دیکھا جا سکتا ہے:

"بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انھیں کہہ، جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے

سامنے سے بھگا دو اور ان کی مورتیں فنا کر دو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو
توڑ دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے
والے ہیں خارج کر دو اور وہاں آبسو، کیوں کہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی
ہے کہ اس کے مالک بنو۔ (۳۳: ۵۱-۵۴)

اور جب کہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کر دے تو انہیں مار اور حرم کیجیو،
نہ تو کوئی ان سے عہد کیجیو، اور نہ ان پر رحم کر بلکہ تم ان کے مذبحوں کو ڈھا دو اور
ان کے بتوں کو توڑ ڈالو، ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی
مورتیں آگ میں جلا دو۔ (۷: ۲-۵)

غرض کہ ظالموں کے مقابلہ مظلوموں کے ساتھ اللہ کی مدد ہونا اور ظلم کو روکنے کے لیے ظالموں کا پنجہ تھامنا ایک ایسی بات ہے، جو تمام مذاہب کی مشترکہ تعلیم ہے؛ کیوں کہ اگر خدا بھی ظالموں ہی کا طرف دار ہو تو پھر کون سا ایوانِ انصاف ہوگا جہاں ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ملے گی اور مظلوموں کی تسکینِ خاطر کا سامان ہوگا؟

پانچویں آیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا
فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ. (التوبہ: ۱۲۳)

اے ایمان والو! تمہارے آس پاس جو کفار ہیں، ان سے جنگ کرو اور وہ
تمہارے اندر سختی (مضبوطی) پائیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ان کافروں سے جنگ کے لیے کہا گیا ہے جو ان کے قرب و جوار میں تھے، یعنی اہل مکہ اور ان کے حلیف؛ کیوں کہ یہی مدینہ کے قریب کافروں کی آبادیاں تھیں اور اہل مکہ کا مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک تھا وہ ظاہر ہے۔ اگر مطلقاً کافروں کے مارنے کا حکم ہوتا تو قریب و دور کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ مدینہ، یمن اور شام کے درمیان شاہراہ کا درجہ رکھتا تھا اور مختلف غیر مسلم قافلے مدینہ کے قرب و جوار سے گزرتے رہتے تھے، اگر یہ حکم مطلقاً ان سے متعلق ہوتا تو ان کے غیر مسلموں پر بھی حملہ کرنے کو کہا جاتا؛

لیکن یہاں قرآن نے ایسا حکم نہ دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کا منشا ان مشرکین سے جنگ کرنا تھا جو بار بار مسلمانوں پر یلغار کرتے رہتے تھے۔ نہ دشمنی کا پاس و لحاظ کرتے تھے، نہ صلح اور معاہدہ کا لحاظ، چنانچہ ابن زید نے بھی کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب تھے۔

المراد بهذه الآية وقت نزولها العرب. (تفسیر قرطبی ۸۔ ۲۹۷)

پھر اس آیت میں جو "غلظة" کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی سختی کے بھی آتے ہیں اور طاقت و مضبوطی کے بھی۔ یہاں اصل میں یہی طاقت و مضبوطی کا معنی مراد ہے، ای شدة وقوة وحمية۔ (حوالہ سابق ۲۹۷) یعنی مقصد یہ ہے کہ جو مشرکین تم سے برسر جنگ ہیں وہ تم کو طاقتور محسوس کریں، مرعوب رہیں اور تم کو روند جانے کی جرأت نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی قوم کو یقیناً دوسروں پر تو ظلم نہیں کرنا چاہیے، لیکن اپنے آپ کو ایسا طاقتور ضرور رکھنا چاہیے کہ دوسرے اس کو لقمۂ تر نہ سمجھ لیں۔ یہ بالکل معقول اور قرینِ انصاف ہے۔ مثلاً ہم ہندوستان کے رہنے والے اپنے وطن کے بارے میں جذبہ رکھتے ہیں کہ ہم دوسروں پر زیادتی تو نہیں کریں گے، لیکن ہم اپنے آپ کو یقیناً ایسا خود مکتفی بنا کر رکھیں گے کہ کسی کو ہم پر بری نگاہ ڈالنے کی ہمت نہ ہو۔ اگر ہم ایسا کہیں تو کیا یہ کوئی غلط بات ہوگی؟

چھٹی آیت

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبہ: ۱۱۱)

بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جان و مال اس کے بدلے خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں، تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں۔ اسی پر سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہے؟ سو تم خوشی مناؤ اپنی معاملت پر جو تم نے کی ہے اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں یہی بات تو کہی گئی ہے کہ جو مسلمان ظالموں کے خلاف سر ہتھیلی پر لے کر نکل آئیں اور اس راہ میں اپنی جان و مال کی بھی فکر نہ کریں۔ ان کو اللہ جنت سے نوازیں گے۔

قرآن کے اس ارشاد میں کون سی بات خلاف انصاف ہے؟ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں اپنے دیش کی حفاظت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے۔ ہندو مذہب کی تاریخ میں گیتا نے جس جنگ کی تفصیل بیان کی ہے، یعنی کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ، اس میں کرشن جی، ارجن کو یہی صلاح دیتے ہیں کہ وہ اسے حق و باطل کی جنگ سمجھ کر کوروؤں کے خلاف صف آرا ہوں اور اس پر پانڈوؤں کے بادشاہ ارجن سے خدا کی مدد کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہندو مذہب میں منوجی کی ہدایات کی خاص اہمیت ہے۔ ان کا بیان ہے:

> ”روئے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کبھی منہ نہیں موڑتے، وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں۔“ (۸۹/۷)

دیکھا آپ نے! قرآن نے تو اللہ کے راستے میں جوابی جنگ پر جنت کا وعدہ کیا ہے، لیکن منوجی محض دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے اور ملک گیری کی غرض سے جنگ کرنے والوں کو بھی جنت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ قرآن کے اس ارشاد پر تو دیکھنا چاہیے کہ اس نے ظالموں کے مقابلہ خود سپردگی کے بجائے آخری حد تک جرأت و حوصلہ سے کام لینے کی تلقین کی ہے، کیونکہ اگر مظلوموں میں یہ حوصلہ و ہمت اور جوش و جذبہ نہ ہو تو ظالموں کا پنجۂ استبداد سخت سے سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور دنیا فساد کی آماجگاہ بن جائے گی۔

ساتویں آیت

> مَلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۔ (الاحزاب: ۶۱)
>
> پھٹکارے ہوئے، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور ضرور قتل کر دیے جائیں گے۔

یہ بھی ان آیتوں میں سے ایک ہے جن کو وی۔ ایچ۔ پی نے قرآن مجید اور مسلمانوں

کے خلاف پروپیگنڈہ کا عنوان بنایا ہے۔ اس آیت کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلی اور بعد کی آیت کے ساتھ اس کا ترجمہ دیکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (الاحزاب: ۶۰)

منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اور جو لوگ مدینے میں افواہ اڑاتے ہیں، اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھائیں گے، پھر وہ اس شہر میں آپ کے ساتھ تھوڑی دیر ہی رہ سکیں گے۔

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۔ (الاحزاب: ۶۱)

ایسے لوگوں پر پھٹکار ہے، یہ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔ (احزاب: ۶۱)

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الاحزاب: ۶۲)

ان سے پہلے مجرمین کے لیے بھی اللہ کا یہی دستور رہا ہے اور تم اللہ کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

یہ آیات بلکہ تقریباً یہ پوری سورت بنیادی طور پر پانچ ہجری کے واقعات، غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنو قریظہ سے متعلق ہے۔ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے پڑوسیوں نے ان کے ساتھ ناقابل فراموش دغا سے کام لیا تھا۔ مسلمانوں کا یہودیوں سے یہ معاہدہ تھا کہ مدینہ پر جب بھی کوئی حملہ ہوگا تو ہم لوگ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ بصورت حال یہ تھی کہ اہل مکہ نے اس جنگ میں بلا کسی اشتعال اور سبب کے نہ صرف خود حملہ کیا، بلکہ اپنے دوسرے حلیف قبائل کو بھی لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ افرادی وسائل اور اسلحہ کے اعتبار سے مظلوم مسلمانوں اور حملہ آوروں کے درمیان اتنا فرق تھا کہ مسلمان جنگی تدبیر کے طور پر خندقیں کھودنے پر مجبور ہو گئے۔ اس موقع سے یہود مسلمانوں کی مدد تو کیا کرتے اور حسب

مدینہ منورہ میں یہودیوں کی حالت میں کیا حصہ لیتے کہ وہ تیر جا نشانہ بھی نہ رہتے اور ان مشرکین کے ساتھ ہو لیے، اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ وہ تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، لیکن ان کی ساری ہمدردیاں مسلمانوں کے دشمنوں سے تھیں، ان حالات میں مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ان کا ایمان و یقین اور حوصلہ و ہمت ہی تھی۔ یہ طرح طرح کی افواہیں اڑا کر مسلمانوں کو خوف میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، تاکہ ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور یہ نفسیاتی طور پر کمزور ہو جائیں، یہی دونوں طبقے ہیں جن کو "منافقین" سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرنے کے درپے بھی ہوتے تھے اور شریف مسلمان خواتین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑایا کرتے تھے، ایسی افواہوں سے انسان نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی گروہوں کے بارے میں قرآن مجید نے کہا کہ ان کا ایسے پڑوسی اور بغل دشمنوں کو اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں، کیوں کہ دوست نما دشمن انسان کے لیے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، کوئی صاحب انصاف دیکھے کہ جو لوگ بظاہر کسی قوم کے ساتھ ہوں یا کسی ملک کے شہری ہوں مگر اسی قوم و ملک کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، ان کے دشمنوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں اور برے وقتوں میں سارے عہد و پیماں کو فراموش کر کے دشمنوں کے دوش بدوش کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا قتل اور پھانسی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟؟

پھر قرآن مجید نے ان پر پھٹکار بھیجتے ہوئے مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ ان پر بلہ بول دیں، حالانکہ اگر قرآن نے ایسا کہا ہوتا تو بے جا نہیں ہوتا، لیکن ایسا حکم دینے کے بجائے صرف پیشین گوئی کی گئی ہے اور بار بار بے وفائی کرنے والوں کو سنبھلنے کا موقع دیتے ہوئے انتباہ دیا گیا ہے، کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ان کا انجام دنیا میں بھی ہلاکت و بربادی ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ کی سنت یہی رہی ہے، یہ تحمل و بردباری قابل لحاظ ہے، اگر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہوتا کہ تم کوئی مہلت دیے بغیر ان بغل دشمنوں کا قلع قمع کر دو، تب بھی یہ کوئی خلاف انصاف بات نہیں ہوتی، لیکن ایسی بدعہدیوں

خلاف اقدام کی اجازت دی گئی ہے جہاں تک ایسے کاموں سے جنگ کی ترغیب دینے کی بات ہے تو یہ ـــ جیسا کہ عرض کیا گیا ـــ تمام ہی مذاہب میں موجود ہے۔

کرشن جی کا ہندو مذہب میں جو اہم مقام ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہر ہندو بھی اس سے واقف ہے کہ ارجن ـــ جو کوروں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا ـــ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے انھوں نے کیسی کیسی ترغیب دی دنیا اور آخرت کی فلاح و نجاح اور حیات و موت کے فلسفے بیان کیے، گیتا ان ہی مضامین سے پُر ہے۔

مثلاً کرشن جی ارجن سے فرماتے ہیں:

> اے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے، جو تیرے لیے خود بخود کھل گیا ہے، ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے، لہٰذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کرے گا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کرکے پاپ جمع کرے گا، پھر سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونے والی مذمت کرتے رہیں گے، یہ مذمت باعزت انسان کے لیے موت سے بدتر ہے۔ (۲: ۳۳-۳۴)

غور کیجیے! اگر قرآن نے تو حملہ آوروں کی مدافعت کی ترغیب دی ہے، لیکن کرشن جی ارجن کو اقدامی حملہ کی ترغیب دیتے ہیں، اور کرشن جی کے دوسرے مواعظ جو گیتا میں مذکور ہیں، ان سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس کا مقصد اصل میں کشور کشائی، طلب عزت اور ملک و مال کا حصول تھا نہ کہ ظالم کے ظلم کا سدباب ـــ تو ایک طرف اس بے مقصد جنگ کی ترغیب کو تو برا نہیں سمجھا جائے اور دوسری طرف جارح کے خلاف اقدام کرنے کو بھی زیادتی سمجھا جائے، یہ کس قدر خلاف انصاف بات ہے!

مالِ غنیمت سے متعلق دو آیتیں

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (الانفال: ٦٩)

اس میں آر ایس ایس، وی ایچ پی والوں نے "حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" کا ترجمہ یہ ہے: "ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دینے لگیں" حالانکہ یہاں "صاغرون" سے مراد وہ تعیین کے اقتدار کو تسلیم کرنا ہے، یعنی مفتوح قوم فاتح کے مقابلے اپنے رعایا ہونے کی حیثیت کا اعتراف کرلے، جیسا کہ آج بھی ہتھیار ڈالنے والے ممالک اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کا مقصد تحقیر و تذلیل نہیں ہے، جیسا کہ آر ایس ایس، وی ایچ پی کے پروپیگنڈہ یا ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے، جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انہیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے منافی ہوتا، اس لیے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس جزیہ کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کے حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالت کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا، لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، اس لیے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۱۲/ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۲۴/ اور زیادہ آمدنی والوں کے لیے ۴۸/ درہم۔ ۱۲/ درہم ۳ تولے سے کچھ کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲ درہم ۳۶۵ روپے سے کچھ کم و بیش ہے۔ آپ حضرات غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور نگہبانی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے پیسے لے کر دہشت گردان ملک کی حفاظت کا انتظام کردے، اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرلے تو ہم شکر گذار ہوں گے، یہ ہے اس جزیہ کی حقیقت جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم و زیادتی،

تشدد اور رواداری کا عنوان دیا گیا ہے۔

مشرکین ناپاک ہیں؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (التوبہ:۲۸)

"اے ایمان والو! شرک کرنے والے (مورتی پوجک) لوگ ناپاک ہیں۔"

اس آیت کے سلسلہ میں چند نکات ملحوظ رکھے جانے چاہئیں:

(۱) یہاں مشرک سے صرف بت پرست (مورتی پوجک) مراد نہیں ہیں، جیسا کہ وی، ایچ، پی والوں نے آیت کا ترجمہ کیا ہے، بلکہ وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی ذات یا اس کی مخصوص صفات و اختیارات میں دوسروں کو شریک ٹھہرائیں، خواہ وہ بت کا پرستار ہو، یا کسی پیغمبر کو خدا کا درجہ دیتا ہو، یا اللہ کے کسی نیک بندہ کو خدا کی قدرت و اختیار میں ساجھے دار رکھتا ہو۔ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن انہوں نے خدانخواستہ غیر اللہ کو خدا کا درجہ دے رکھا ہو اور رسول اور اولیاء کی ذات میں وہ اختیارات مانتے ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں، تو وہ بھی مشرک کا مصداق ہیں۔

(۲) مشرکین کو ناپاک کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا جسم ناپاک ہے، ان کے کپڑے ناپاک ہیں، یا ان کا جھوٹا ناپاک ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کی مہمان نوازی کی ہے، خود ان کی دعوت قبول فرمائی ہے، مسجد نبوی میں ان کو ٹھہرایا ہے، اپنے بستر پر انہیں بٹھایا اور سلایا ہے، اگر انہیں جسمانی اعتبار سے ناپاک سمجھا جاتا تو کس طرح آپ ایسا عمل فرماتے، اس لیے یہاں عقیدہ اور فکر کی ناپاکی مراد ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ گندا ذہن رکھتا ہے، یا آپ کہتے ہیں کہ فلاں دہشت گردوں کے ناپاک منصوبے ناکام کر دیے گئے، یہاں ناپاکی سے عمل اور سوچ کی غلط اور مبنی بر خطا ہونے کا اظہار کیا جاتا ہے، نیز اس آیت میں مشرکین

☆ اے بہادر! تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جو دونوے
تک کو مغلوب کرایا۔ (رگ وید۔ ۷: ۹۹: ۴)

تو اپنے ہتھیار سے نکٹے دسیوں کو قتل کرتا ہے۔ (رگ وید۔ ۵: ۲۹: ۱۰)

کہیں ان لوگوں کو "سیاہ رو" مخلوق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (رگ وید: ۲: ۲۰: ۷) کہیں انہیں "گھن کھائے درخت" کہا جاتا ہے۔ (رگ وید: ۸: ۳: ۶) کہیں "کالے خون" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (سام وید: ۳: ۲: ۴: ۱۱) ویدوں میں ادھری لوگوں کے لیے حریص، راکشش اور خبیث، دشمن وغیرہ کے نام دیے جاتے ہیں۔

اب انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کہ قرآن نے تو ایک جگہ مشرکین کو ناپاک کہا ہے، لیکن ویدوں میں اس مذہب کے مخالفین کو خبیث، بیل جیسے جبڑے والے، نکٹے، سیاہ رو، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، بدذات، پاپی، حریص، راکشش وغیرہ کے الفاظ بے تکلف کہتی ہیں، بلکہ اتھروید میں آدھری لوگوں کے لیے بعینہٖ "ناپاک" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

> یاتو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید! اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لیے اٹھیں، توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انہیں مار کر، مردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں۔ اس "پلید" کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضا کو توڑ ڈال۔ (اتھروید: ۸: ۳: ۶-۷-۱۰)

(۵) یہ تو وہ القاب ہیں جو ادھری لوگوں کو دیے گئے ہیں، لیکن منو جی کی تعلیمات میں عقیدہ و فکر کی بنیاد پر نہیں، بلکہ نسل و خاندان کی بنیاد پر شودروں کو نہایت ذلیل و حقیر القاب دیے گئے ہیں اور ان کے بارے میں وہ احکام دیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شودر جسمانی طور پر پیشاب، پاخانہ کی طرح ناپاک اور قابلِ اجتناب ہیں، اس سلسلے میں ہندو مآخذ میں اتنا کچھ ہے کہ اگر ان سب کو نقل کیا جائے تو ایک رسالہ بھی ناکافی ہے، چند نمونے یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا (النساء: ۱۰۱)

اور جب تم ملک میں سفر کرو تو تم پر حرج نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کرو، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کافر تم کو ستا دیں گے، بیشک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ. (المائدہ: ۵۱)

اے ایمان والو! تم یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا وہ انہیں میں سے ہوگا، بیشک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ. (المائدہ: ۵۷)

اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) مل چکی ہے اور وہ ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان والے ہو۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (التوبہ: ۲۳)

اے ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلہ کفر کو پسند کریں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوں گے۔

چوتھی آیت (النساء: ۱۰۱) میں بھی اہل مکہ کا بیان ہے کہ وہ تمہارے کھلے ہوئے اور سخت دشمن ہیں، کہیں مسلمان کسی مرحلہ پر دھوکہ نہ کھا جائیں اور ان کی دعوت نماز دشمنی کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہ آیت بھی انہیں مشرکین مکہ سے متعلق ہے۔

چنانچہ اس آیت کے بعد نماز خوف کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ (النساء: ۱۰۲) کہ جب جنگ کی حالت ہو اور دونوں طرف سے فوجیں صف آرا ہوں، اس وقت مسلمانوں کو کس طرح نماز ادا کرنی چاہیے؟ کیوں کہ اہل مکہ سے اس وقت پے در پے معرکے درپیش تھے۔ یہ آیت تمام غیر مسلموں سے متعلق نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کی واضح دلیل ہے۔ آپ نے مدینہ میں یہودیوں سے معاہدہ کیا۔ نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا، بنو خزاعہ کافر تھے، لیکن مسلمانوں کے حلیف اور دوست تھے، اس طرح کے معاہدے آپ نے بعض اور غیر مسلم قبائل سے بھی کیے ہیں، اگر کفار سے مطلق دوستی کی اجازت نہ ہوتی اور وہ سب کے سب دشمن قرار دیے جاتے تو آپ نے کیسے ان غیر مسلم قبائل کو اپنا حلیف بنایا ہوتا؟

دوسری اور تیسری آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمان بار بار یہودیوں سے معاہدہ کرتے تھے اور یہودی اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے تھے، یہاں تک کہ غزوۂ خندق میں تو انہوں نے اہل مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی بیخ و بن اکھاڑ دینے کی کوشش کی۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متہم کرتے تھے اور ولد الحرام ٹھہراتے تھے، حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگاتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لعنت بھیجتے تھے، قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا، ان پر اور ان کی والدہ پر جو تہمتیں لگائی جاتی تھیں، اس کی تردید کی، لیکن ہوا یہ کہ وہ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو تقویت پہنچاتے اور اسلام کی دعوت کو قبول کرتے، اپنے پیغمبر کو گالی دینے والے یہودیوں کے ساتھ مل بیٹھے، اس لیے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ انہیں اپنا رازدار نہ بنائیں، کیوں کہ اپنے شدید اختلاف کے باوجود مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے میں یہود و نصاریٰ اور کفار مکہ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، عقیدہ و مذہب کے تضاد کی وجہ سے

مسلمان انہیں اپنا رازدار بنا کر کہیں نقصان نہ اٹھالیں۔

پانچویں آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ نسبتاً بلکہ خونی رشتہ کی محبت کے مذاہب اور عقیدہ کا تعلق زیادہ اہم ہے، یعنی اگر کوئی شخص ایمان لے آیا ہو، اس کے آباء واجداد، بھائی بہن کفر کی حالت میں ہوں تو یہ بات نہ ہو کہ اپنے اعزہ اور اقارب کی محبت اور ان کا تعلق اسے حق کی راہ سے منحرف کر دے، کیوں کہ جہاں حق اور ناحق کا مقابلہ ہو اور دو ایسی باتوں کا ٹکراؤ ہو جن میں ایک طرف حق اور سچائی ہو اور دوسری طرف رشتہ وقرابت ہو تو سچائی کو رشتوں پر ترجیح دینی چاہیے۔ یہ تو اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے اور ہر قوم کے لیے ہے کہ جس چیز کو وہ حق اور انصاف سمجھتی ہو اسے دوسرے تمام تعلقات پر غالب رکھے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو غیر مسلم اقرباء ہوں ان سے مسلمانوں کو نفرت کرنی چاہیے، ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، آپؐ نے غیر مسلم کی عیادت کی ہے، مکہ میں قحط پڑا تو آپؐ نے کفار مکہ کے لیے امداد بھجوائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مشرک عزیز کے لیے ریشمی عباء بھیجی، بعض صحابہؓ کی والدہ ان کے مسلمان ہونے پر ناراض تھیں اور انہوں نے احتجاجاً کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا، آپؐ نے انہیں نصیحت کی کہ اسلام پر قائم رہنا بھی ہے، لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ والدین کے ساتھ بدسلوکی نہ ہو۔ اگر غیر مسلم رشتہ داروں سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہوتی، تو مسلمانوں نے اس طرح حسن سلوک کیوں کیا ہوتا؟! اصل یہ ہے کہ موالات سے ہر طرح کی دوستی اور تعلق مراد نہیں ہے، بلکہ ایسی دوستی مراد ہے جو انسان کے فکر وعمل پر اثر انداز ہونے لگے اور کسی گروہ کی راز دارانہ باتیں جن کا دوسروں تک پہنچنا اس گروہ کے لیے ضرر کا باعث بن سکتا ہو، پہنچنے نہ دے، ایسے گہرے تعلق کو اصل میں "موالات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تعلق کے مختلف درجات ہیں، ان کو ایک ممتاز صاحب علم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تعلقات چار طرح کے ہو سکتے ہیں: مدارات، مواسات، معاملات اور موالات۔ مدارات: دوستانہ برتاؤ اور خوش

خلقی کا نام ہے، یہ غیر مسلموں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ مواسات: غمگساری، نفع رسانی اور مالی تعاون سے عبارت ہے، غیر مسلموں کے ساتھ بھی مواسات کا حکم دیا گیا ہے۔ تیسرے معاملات: یعنی مالی کاروبار جیسے تجارت، ملازمت وغیرہ، اس میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی فرق نہیں، چوتھا درجہ موالات کا ہے، موالات سے مراد ایسی دوستی ہے کہ آدمی دوسرے کی تہذیبی اور ملی اقدار کو قبول کرنے لگے اور اپنے رازہائے سربستہ کو دوسروں تک پہنچائے جس سے اسے مضرت بھی پہنچ سکتی ہے، قرآن نے اسی درجہ تعلق ''موالات'' سے منع کیا ہے، لا تجعلوا خاصتکم و بطانتکم منھم۔ (تفسیر قرطبی: ۱۷۸/۲/۳) اسی ممانعت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان شادی بیاہ کا تعلق نہیں ہو سکتا، وہ ایک دوسرے سے میراث کے حق دار نہیں ہوتے۔

پس دو باتیں ان آیات کے بارے میں ذہن میں رکھنے کی ہیں: اول یہ کہ یہ آیات بھی ان کفار کے پس منظر میں ہیں جن سے اس وقت مسلمانوں کا سابقہ تھا، دوسرے اس میں ہر طرح کی دوستی کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ ایسی دوستی کی ممانعت ہے جس میں مسلمان اپنی تہذیبی اور تمدنی قدروں سے محروم ہو جائیں، وہ دوسری قوموں کے ساتھ تہذیبی اور فکری اعتبار سے جذب ہونے لگیں، یا جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہے ان تک اپنے ایسے راز و اسرار کو پہنچانے لگیں جو پوری قوم کے لیے نقصان دہ اور مضرت رساں ہوں ___ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی قوم اگر اپنی تہذیب کی حفاظت اور بچاؤ کی کوشش کرتی ہے تو یہ کوئی مذموم و ناپسندیدہ بات نہیں، آج تو تمام تہذیبی اکائیوں کے لیے عالمی سطح پر اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ اپنے تمدن کی حفاظت کریں اور اسے کھونے نہ پائیں۔ خود ہمارے اس ملک میں چھوٹی چھوٹی تہذیبی اکائیوں کی رعایت سے بعض ریاستوں میں خصوصی قوانین ہیں، وہاں دوسرے لوگ زمینیں بھی نہیں خرید سکتے، نیز ملکی قوانین کی جگہ بعض امور میں ان کے رواجی قانون کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے یہ کسی گروہ کے خلاف نفرت کی تعلیم نہیں، بلکہ مسلمانوں کو مختلف مذہبی اکائیوں کے ساتھ رہتے

ہوتے بھی اپنی شناخت کو برقرار رکھنا اور اپنے مذہبی اقدار پر ثابت قدم رہنے کی تعلیم ہے۔

اب یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ خود ہندو مذہب میں جو لوگ ادھری اور ہندو مذہب پر ایمان نہ رکھنے والے سمجھے جاتے تھے، ان کے لیے عام طور پر "دشمن" ہی کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے، بلکہ اس طرح ان کا ذکر کیا جاتا ہے، جیسے ان کا نام ہی دشمن ہو، چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

☆ ہم تیری مدد سے دولت حاصل کریں، ہم تیری اعانت سے اور آریوں کی قوت سے اپنے تمام دشمن دسیوں کو مغلوب کرکے۔ (رگ وید: ۲:۱۱:۱۹)

☆ اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کرکے خوشحال ہوں۔
(رگ وید: ۶:۸:۱۳)

☆ دشمنوں کے قتل کرنے والے اور جیرا دسیوں کو ہلاک کرنے والے!
(رگ وید: ۱۰:۸۳:۳)

☆ تو ہمارے دشمنوں کو قتل کر۔ قتل کیے جاؤ دشمنوں کو کچلے جاؤ۔
(رگ وید: ۱۰:۸۴:۲-۳)

☆ اگنی اور سوریا! تو خبیث دشمن کو جلا دے۔ (اتھروید: ۳:۳:۳-۱)

غرض کہ ہندو مذہبی کتابوں میں ان لوگوں کو جو اس مذہب کو نہ مانتے ہوں یا جن کو آریہ نسلی اعتبار سے حقیر جانتے ہوں، انہیں عام طور پر "دشمن" ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شودروں کا بدقسمت گروہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اگر دوستی اور دشمنی کے پیمانے میں رکھ کر ان کے بارے میں ہندو مذہبی کتابوں کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو حقارت کے علاوہ ان سے نفرت کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ اونچی ذات کے لوگوں کو ان لوگوں سے بے تعلق رہنا چاہیے اور ان سے ہرگز دوستی کا رشتہ نہیں جوڑنا چاہیے۔ مثلاً منوجی شودروں کے بارے میں ہدایت کرتے ہیں:

☆ وہ کسی برادری سے خارج کیے ہوئے شخص یا چنڈال کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔ (منوسمرتی: ۳:۷۹)

واضح ہو کہ چنڈال سے مراد وہ شخص ہے جو شودر مرد اور برہمن عورت کے اختلاط سے پیدا ہوا ہو۔

☆ جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دے گا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائے گا۔ (منوسمرتی ۴:۸۱)

☆ چنڈال اور سپاک لوگوں کی رہائش بستی کے باہر ہونی چاہیے۔ (منوسمرتی ۱۰:۵۱)

☆ براہمن شودر سے کبھی دان نہ لے۔ (منوسمرتی ۱۱:۲۴)

یہ محض چند مثالیں ہیں، ورنہ منوسمرتی تو ایسی تعلیمات سے پُر ہیں اور ان کو اتنا قابل اجتناب سمجھا گیا ہے کہ:

☆ اگر براہمن کسی بلی یا نیولے یا چڑیا یا مینڈک یا کتے یا چھپکلی یا الو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے۔ (منوسمرتی ۱۱:۱۳۲)

غور فرمایئے کہ نسل و مذہب کی بنیاد پر ایک طبقے کے ساتھ کیسی نفرت و عداوت کو روا رکھا گیا ہے اور کس کس طرح لوگوں کو ان سے دور رہنے کی تعلیم دی گئی ہے؟؟

غیر مسلم اور ہدایت

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (التوبہ ۔ ۳۷)

اللہ کافر لوگوں کو صحیح راستہ نہیں دکھاتا

یہ آیت کا صرف آخری ٹکڑا ہے، پوری آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جائے تو خود بخود غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ بات بتائی کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت سے ہی سال کے بارہ مہینے ہیں، یعنی ۱۲ مہینوں میں سورج کے گرد زمین کی گردش پوری ہوتی ہے، ان میں سے چار مہینے "حرام" ہیں، ان چار مہینوں کے حرام ہونے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہی عربوں میں چلا آرہا تھا۔ ان مہینوں کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں جنگ کی مکمل ممانعت ہے، عرب کے خطہ میں جہاں کوئی قانونی حکومت نہیں تھی، ان

مہینوں کا احترام لوگوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا، لیکن کبھی ان کی ضرورت میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے تھے، یہ چار مہینے تھے: رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔

لیکن صورت حال یہ تھی کہ جب وہ ان مہینوں میں سے کسی مہینہ میں جنگ کے لیے مناسب موقع پاتے تو مہینے کو بدل دیتے، مثلاً کہتے کہ اس سال ذوالقعدہ کی جگہ صفر ہے اور صفر کی جگہ ذوالقعدہ، اسی طرح کبھی مہینہ بڑھا دیتے اور بارہ مہینوں کی جگہ تیرہ مہینوں کا سال قرار دیتے، یا کبھی مہینہ گھٹا کر ۱۱ مہینوں کا سال کر دیتے۔ قرآن مجید نے ان کے اس رویہ پر تنقید کی اور فرمایا:

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (توبہ: ۳۷)

"بیشک نسی (مہینوں کا اپنی جگہ سے ہٹا دینا) کفر میں زیادتی ہے، اس کے ذریعہ کفر کرنے والے گمراہ کیے جاتے ہیں، وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام سمجھتے ہیں، تاکہ ان مہینوں کی جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے، گنتی پوری کر لیں، پھر اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کو حلال کر لیتے ہیں، ان کی بداعمالیاں انہیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

غرض کہ اہل مکہ کے جانتے بوجھتے اس غلط روش کو اختیار کرنے کی قرآن نے مذمت کی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ عوام کو گمراہ کیا جاتا تھا، مثلاً کسی چیز پر سالانہ سود مقرر ہوتا ہے اور ادائیگی میں مشورہ کر کے دس مہینے کا سال قرار دے دیا تو اب اس کی مالک کو پورا سود بیچارے بھولے بھالے عوام سے وصول کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا، اسی طرح کسی کو ایک سال کے لیے مزدوری پر رکھا اور اجرت سالانہ متعین کی، اب بارہ کے بجائے چودہ ماہ کا سال مقرر کر لیا اور دو مہینے زیادہ کام لے لیا، اسی طرح یہ عوام کو بے وقوف بنانے کا حیلہ تھا، اسی کو قرآن نے بتایا کہ یہ کفر میں زیادتی ہے، اس سے گمراہ کیا جاتا ہے اور حرام کو حلال کیا جاتا ہے۔

قول یہ کہ یہ ارشادات لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں، نہ کہ تمام غیر مسلموں سے متعلق۔ دوسرے قرآن نے ہمیں بتایا کہ ان سے حضرت عیسیٰ نے عہد لیا تھا کہ آپ کے بعد جو نبی آئے گا، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وہ ان پر ایمان لائیں گے، لیکن انہوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا، حالانکہ عیسائیوں نے اور خاص کر سینٹ پال نے عیسائی عقائد کو پوری طرح رد و بدل کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں اپنی طرف سے آمیزشیں کر دی ہیں، لیکن اس کے باوجود انجیل میں ابھی بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی طرف اشارے موجود ہیں۔ یہاں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو ارشادات نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

- اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ (یوحنا ۱۴:۱۶)
- میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے، کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔" (یوحنا ۱۶: ۷، ۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی نبوت کا دعویٰ فرمایا، قرآن نے آپ کو "خاتم النبیین" یعنی ابد تک کی نبوت کا حامل قرار دیا، اور آپ نے دنیا پر واضح کیا کہ حضرت عیسیٰ اور ان کے معاندین میں کون راستباز ہے اور گنہگار؟ اس طرح عیسائیوں کے لیے حضرت عیسیٰ اور انجیل کی تعلیم کے مطابق آپ پر ایمان لانا ضروری تھا، لیکن انہوں نے ایمان نہ لا کر اس عہد کی خلاف ورزی کی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی قوموں پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے بعض عذاب نازل کرتے ہیں، ان میں سے ایک ان کے درمیان باہمی اختلاف و افتراق کا پیدا ہو جانا بھی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت

مسلم کے بارے میں بھی فرمایا کہ اس امت پر کوئی اجتماعی عذاب تو نازل نہیں ہوگا، لیکن آپس کا اختلاف، افتراق کا عذاب ان کی شامتِ اعمال کی وجہ سے نازل ہوگا اور مسلمان عملاً آج اس سے گزر رہے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے بارے میں فرمایا کہ قیامت تک عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان سخت اختلاف کی کیفیت باقی رہے گی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیوں میں جتنے زیادہ مذہبی فرقے ہیں، شاید ہی کسی اور مذہب میں ہوں اور مذہبی اختلاف کی بنیاد پر عیسائی فرقوں نے ایک دوسرے کو جس طرح بے تحاشا قتل اور زندہ جلا دینے کی سزا دی ہے، مشکل سے مذاہب کی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال ملے گی، کلیسائی نظام کے زمانہ عروج میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کیے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے، جن میں تین لاکھ چالیس ہزار کا تعلق صرف اسپین سے تھا اور ان میں بتیس ہزار وہ لوگ ہیں جو زندہ جلا دیے گئے، پھر عیسائی حکومتوں کی باہمی منافرت دیکھیے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم، دراصل ان ہی کی باہمی رقابتوں کے نتیجہ میں ہوئیں، جن میں کروڑوں انسان لقمہ اجل بن گئے ۔ یہ قرآن کی ایک پیشین گوئی ہے اور ایسی پیشین گوئی ہے جو انسانیت کے مشاہدہ میں ہے، اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل اعتراض یا مسلمانوں کو کسی فرقہ کے خلاف بھڑکانے والی ہو۔

اس پمفلٹ میں چھ آیتیں وہ ذکر کی گئی ہیں جن میں کفر کرنے والوں کے لیے آخرت کی سزاؤں کا ذکر ہے۔ یہ آیات اس طرح ہیں:

غیر مسلم اور عذابِ آخرت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا. (النساء: ۵۶)

بے شک جن لوگوں نے ہمارے احکام کا انکار کیا، ہم انہیں دوزخ میں داخل کریں گے، جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم انہیں دوسری

کھالوں سے بدل دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں، بیشک اللہ طاقت والا حکمت والا ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْکُفَّارَ نَارَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ہِیَ حَسْبُہُمْ وَلَعَنَہُمُ اللّٰہُ وَلَہُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (توبہ: ۶۸)

منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے، یہی انہیں بس ہے اور ان پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے۔

اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ اَنْتُمْ لَہَا وٰرِدُوْنَ

(الانبیاء: ۹۸)

یقیناً تم اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو، وہ دوزخ کا ایندھن ہیں اور تم لوگ اس میں اترو گے۔

فَلَنُذِیْقَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا عَذَابًا شَدِیْدًا وَّلَنَجْزِیَنَّہُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔ (حم سجدہ: ۲۷)

تو یقیناً ہم کفر کرنے والوں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور ان کو ان کے برے کاموں کا بدلہ دیں گے۔

اس سے پہلے کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ان لوگوں کے بارے میں فرمائی ہے جو قرآن مجید پڑھنے کے وقت شور و غل کرتے تھے اور لوگوں کو قرآن سننے نہیں دیتے تھے۔

ذٰلِکَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰہِ النَّارُ لَہُمْ فِیْہَا دَارُ الْخُلْدِ جَزَآءً بِمَا کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ۔ (حم سجدہ: ۲۸)

یہ بدلہ ہے اللہ کے دشمنوں کا، آگ، اسی میں ان کا ہمیشہ کا گھر ہے، اس کے بدلہ میں کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُکِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْہَا اِنَّا مِنَ

الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ. (السجدۃ ۲۲)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ یاددہانی کرائی جائے، پھر بھی وہ اس سے منہ پھیر لے۔ یقیناً ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والوں، اس کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں اور غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے والوں کے لیے عذاب کا ذکر ہے، یہ بات وی ایچ پی کے بھائیوں کو بہت ناگوارِ خاطر ہے۔ دنیا کی معمولی حکومتیں بھی اپنے مخالفین کو سزائیں دیتی ہیں، وی ایچ پی اور بجرنگ دل والے بہت سے بے قصور لوگوں کو صرف اس لیے تکلیفیں دینا، زندہ جلانا اور نیست و نابود کر دینا درست سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے ہم مذہب نہیں ہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ خدا ایسا عاجز، بے حس اور بے شعور ہو کہ چاہے کوئی اس کا فرماں بردار ہو یا نافرمان، کوئی اس کے سامنے سر جھکائے یا اس کو برا بھلا کہے، کوئی اس کے حق میں دوسرے کو شریک ٹھہرائے، لیکن خدا کوئی حرکت نہ کرے، وہ اپنی آنکھیں اور کان بند کیے رہے اور ظلم و بدی کرنے والوں کو نہ دنیا میں کچھ کہے اور نہ مرنے کے بعد۔ یہ کیسی نامعقول اور ناانصافی کی بات ہے؟ خدا کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ پورا پورا انصاف کرے اور اچھے اور بروں کو ان کے عمل کی جزا و سزا دے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں جزا و سزا کے قانون کو مانا گیا ہے اور اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ انسان کو اچھے عمل کرنے چاہئیں، تاکہ وہ خدا کے عذاب سے بچ سکے، ہندو مذہب میں بعض اعمال پر سورگ اور بعض اعمال پر نرک کی جو پیشین گوئی ہے وہ آخر کیا ہے؟ یہ جو شری کرشن جی ارجن کو ترغیب دیتے ہیں کہ تم کوروؤں پر حملہ کرو، اس سے تمہارے لیے سورگ کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور منو جی کہتے ہیں کہ برہمن شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بھی بٹھا لے تو بھی وہ نرک میں چلا جائے گا۔ یہ سورگ اور نرک کیا ثواب و عذاب سے عبارت نہیں ہے؟ ہندو مذہبی علماء آج جس پنر جنم کے قائل ہیں، اس کے مطابق ایک انسان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے گدھا، کتا اور سور بن سکتا ہے، یہ بھی دھرم کی خلاف ورزی پر خدا کی طرف سے عذاب ہی تو ہے! اس

لیے ان آیات پر اعتراض کے کوئی معنی نہیں، بلکہ اگر خدا نافرمانوں کی گرفت نہیں کرتا تو یہ خدا کی شان اور انصاف کے خلاف بات ہوتی، اگر نافرمانوں کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی تو دنیا میں یہ ناانصافی ہو جاتی کہ دین مخالفوں کو بلاک کر دے۔ (البقرہ: ۲۰ تا ۱۰۵)

ہاں! اگر ان آیات میں اسلام کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کو اکسایا گیا ہوتا کہ وہ خدا کی عدالت کا انتظار نہ کریں، بلکہ خود ہی انہیں سزا دیں اور دے دیں تو اس سے اشکال پیدا ہو سکتا تھا، لیکن قرآن نے یہ اصول بتایا کہ دنیا میں ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق عمل کرے گا، مسلمان دوسری قوموں پر داروغہ نہیں کہ وہ انہیں اپنی راستے پر عمل کرنے کے لیے مجبور کریں۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ: ۲۲) لیکن اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمان ہوں یا غیر مسلم، انہیں خود ان کی بداعمالیوں کی سزا دے گا، قرآن نے بار بار دوزخ میں آگ کی سزا کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو آگ میں جلانے کی سزا دے، اور فرمایا کہ ایسی سزا دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے۔ غرض کہ دنیا کا قانون اور ہے اور آخرت کا قانون اور، اور اگر اللہ آخرت میں بھی ظالم و مظلوم اور فرمانبردار و نافرمان کا فرق نہ کرے تو پھر وہ خدا کہلانے کا مستحق بھی ہے؟

☆☆☆

اسلام — صلح و آشتی کا مذہب

قارئین جب اس تحریر کو پڑھیں گے تو جناب جنرل پرویز مشرف ہندوستان سے واپس ہو چکے ہوں گے، پرویز صاحب پڑوسی ملک کے خود ساختہ صدر ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان پر کارگل جنگ تھوپنے کے پس پردہ اصل شخصیت انہی کی ہے، لیکن اس وقت وہ صلح و امن کے نقیب بن کر آئے ہیں، اور انہوں نے متضاد قسم کی باتیں کی ہیں، پاکستان کے اصل موقف کو دہرایا بھی ہے، اور لچکدار رویہ اختیار کرنے کی بات بھی کی ہے، یہ بات خوش آئند ہے کہ ہمارے ملک نے ایک حد تک ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے، اور ایک میزبان کی حیثیت سے اپنے مہمان کے اعزاز و اکرام کا پورا پورا خیال رکھا ہے، اب وقت ہی بتائے گا کہ یہ ملاقات کس حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے، اور دونوں ملکوں کو امن کی نعمت نصیب ہو پاتی ہے؟ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ہندو پاک دونوں ممالک، دو حصوں میں بٹا ہوا کشمیر ہر جگہ لوگ امن کے چاہتے ہیں، اور دعا کر رہے ہیں کہ ان ملکوں کے درمیان صلح و صفائی کی صورت نکل آئے، تا کہ بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے ملنا آسان ہو جائے، اور ملک کے کثیر معاشی وسائل جو بے معنی جنگ و جدال پر خرچ ہو رہے ہیں، غربت دور کرنے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ ہوں، اگر ایسا ہو جائے تو یقیناً یہ اس خطہ کی بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی، دونوں ملک اپنے وسائل کو اپنے عوام کی فلاح کے لئے خرچ کر سکیں گے، اور مغربی ممالک کی محتاجی اور غلامی سے بھی انہیں نجات حاصل ہوگی۔

افسوس کہ بعض فرقہ پرست اور امن دشمن عناصر ان مواقع پر امن اور صلح کو قوت پہنچانے کی بجائے ان کو غیر حقیقت پسندانہ اور خلاف واقعہ پروپیگنڈہ کے لئے استعمال

کرتے ہیں، چنانچہ اس وقت بھی یہ غلط تاثر پیدا کیا جا رہا ہے کہ اسلام ایک دہشت گرد اور تنگ پسند مذہب ہے، جو دوسری قوموں کے ساتھ صلح، میل جول اور جذبہ باہم کے اصول پر اتحاد کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس لئے اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ صلح کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، اور مسلمان اپنے قومی مزاج کے اعتبار سے ہی شدت پسند ہیں، حالانکہ یہ بات قطعاً خلاف واقعہ اور نادرست ہے۔

اسلام "سلم" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہی صلح کے ہیں، قرآن نے بار بار صلح و آشتی کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے، اور صلح کے بعد پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے، قرآن نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا:

> اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لئے جھک جاؤ، اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں، اور اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو تجھ کو اللہ کافی ہے، اللہ ہی نے تجھ کو اپنی مدد کے ذریعہ اور مسلمان کے ذریعہ طاقت پہونچائی ہے۔ (الانفال ۶۲،۶۱)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ صلح کرنا چاہیں، اور امن و آشتی کے خواہاں ہوں، مسلمانوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ ان کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں، بلکہ اس آیت میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ اگر صلح میں فریق مخالف کی طرف سے اندیشے اور خدشات ہوں تب بھی ممکن حد تک صلح کی راہ اختیار کرنی چاہئے، اور اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز رہیں، اور صلح و امن کے رویہ پر قائم ہوں، ان سے جہاد جائز نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں، چنانچہ تم سے جنگ نہ کریں، اور صلح کی پیشکش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ (النساء ۹۰)

یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو، اور وہاں مسلمان شہریوں

کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہو تو اخلاقی اور سیاسی طور پر تو ضرور ان کے مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ مسلمان حکومت کو ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق نہیں، چنانچہ قرآن کا بیان ہے:

> جو لوگ ایمان لائے اور (مسلم ملک کو) ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے آ جائیں، اور اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں، جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ (الانفال ۷۲)

اسلام نہ صرف مسلمانوں کو صلح کا حکم دیتا ہے، بلکہ خیر امت کی حیثیت سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حسب ضرورت مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں، سوائے اس کے کہ صدقہ کا حکم دیا جائے یا بھلائی کا، یا لوگوں کے درمیان صلح کرائی جائے، (النساء: ۱۱۴) اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کوئی شخص لوگوں کے درمیان صلح نہ کرانے کی قسم کھالے، (البقرۃ ۲۲۴) صلح بہرحال خیر کی چیز ہے خواہ دو فرد کے درمیان ہو یا قوموں کے درمیان: اَلصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء ۱۲۸) اور کیوں نہ ہو کہ اسلام زمین میں امن و خوشحالی کو پسند کرتا ہے: لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (الاعراف ۵۶) بلکہ اگر کسی ملک یا قوم کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہوں، اس وقت بھی ان کے ساتھ بہتر رویہ رکھنا چاہیے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ آج کے دشمن کل کے دوست ہو جائیں، (الممتحنۃ ۷) جیسے قرآن مجید میں بار بار صلح و آشتی کی تعلیم دی گئی ہے، اور بے سبب جنگ و جدال کو منع فرمایا گیا ہے، اسی طرح حدیث میں بھی صلح کرنے اور کرانے کی بڑی ترغیبات منقول ہیں، حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اے ابو ایوب! کیا میں تجھے ایسا صدقہ نہ بتاؤں، جسے اللہ اور اس کے رسول پسند فرماتے ہیں؟ اور وہ یہ ہے کہ جب لوگوں میں باہم بغض و فساد پیدا ہو جائے تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو (مجمع الزوائد ۸/۸۰)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمسایہ قوموں کے ساتھ امن و آشتی اور صلح و امان کی واضح مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ بعثت سے پہلے حلف الفضول میں شریک ہوئے، جس کا مقصد مظلوموں کی بلا امتیاز نسل و قوم مدد کرنا تھا، آپ ﷺ نبوت کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی مجھے اس کی طرف دعوت دے تو میں اسے قبول کروں گا۔

جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور نسلی اکائیوں کے درمیان باہمی امن، مذہبی آزادی، ایک دوسرے کے احترام اور مدینہ کی مشترک مدافعت کے سلسلہ میں تحریری معاہدہ فرمایا، اور اس پر تمام فریقوں کا دستخط لیا گیا، اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ تو سیرت کا ایک اہم عنوان ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین مکہ سے دس سال کے لئے نا جنگ معاہدہ کیا، اور اہل مکہ کی شرطوں پر کیا، اور جب تک خود اہل مکہ کی طرف سے کھلی ہوئی بد عہدی پیش نہ آگئی، آپ اس معاہدہ پر قائم و ثابت قدم رہے۔

پھر جو معاہدہ ہو جائے اس پر قائم رہنا بھی شرعاً واجب ہے، یہ بات کہ ایک طرف صلح کی میز پر بیٹھیں، اور دوسری طرف اسی فریق کے خلاف اندرونی ریشہ دوانیاں بھی جاری رکھیں، کسی طرح درست نہیں، قرآن نے عہد و پیمان کی پابندی پر بہت زور دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو، یقیناً عہد کے بارے میں سوال ہوگا: وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل: ۳۴) اہل ایمان کی علامت بتائی گئی ہے کہ وہ امانتوں اور عہد و پیمان کی نگہداشت کرتے ہیں، (مومنون: ۸) رسول اللہ ﷺ نے اسے منافق قرار دیا ہے کہ آدمی عہد کے بعد اس کی خلاف ورزی کرے: اذا عاهد غدر، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گذر چکا ہے کہ اگر کسی ایسی حکومت کی جانب سے اس کے مسلمان شہریوں پر زیادتی ہو جس سے صلح ہو چکی ہے، تو وہاں مسلمانوں کو اپنا ہاتھ روکے رکھنا ہوگا۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو برت کر دکھایا ہے، صلح حدیبیہ کے فوراً بعد حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اس دفعہ سے مستثنیٰ کر دیا جائے، لیکن اہل مکہ تیار نہیں ہوئے، چنانچہ آپ ﷺ نے ملول خاطر کے ساتھ انہیں واپس فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ ہم ان سے معاہدہ کر چکے

ہیں، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، اور ہمارے دین میں معاہدہ میں خلاف ورزی کی گنجائش نہیں۔ ولا یصلح لنا فی دیننا الغدر (سیرت ابن ہشام، ۳۲۳/۲ ۳۲۴) اسی طرح حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ جب مکہ سے مدینہ گئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی واپس فرمادیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عہد کی پابندی اسلام کی نظر میں کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ بین قومی معاہدات کی خلاف ورزی کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ جب کوئی قوم بدعہدی کرتی ہے تو اللہ ان پر دشمنوں کو مسلط فرمادیتے ہیں: **ما نقض قوم بالعہد الا سلط اللہ علیہم العدو** (موطا امام مالک، باب ما جاء فی الوفاء بالامان)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و آشتی، صلح و سلامتی اور انسانی اخوت و بھائی چارگی کا مذہب ہے، جو نہ صرف صلح کو پسند کرتا ہے، بلکہ چاہتا ہے کہ مسلمان صلح میں پیش قدمی کریں، اور جب موقع ضرورت پڑے تو اس کے لئے اپنے جذبات و مفادات کی ایک گونہ قربانی بھی دیں، اور نہ صرف خود صلح کریں، بلکہ دوسری قوموں کے درمیان بھی صلح کے نقیب اور نمائندہ بن کر سامنے آئیں، اور جن شرطوں پر صلح ہو، ان کے پابند و پاس دار رہیں!

(۲۰ جولائی ۲۰۰۱ء)

سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے سے نکال دو، اور ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو، اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں، خارج کر دو، اور وہاں آباد ہو۔ (استثناء: ۳۳:۵۰، ۵۳)

بائبل نے جنگی اعتبار سے غیر اسرائیلیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ علاقہ جس کو یہودی عقیدہ کے مطابق خدا نے اسرائیل کی میراث میں دیا ہوا ہے، اس علاقہ کا جنگی قانون یہ ہے کہ مردوں اور شادی شدہ عورتوں کو قتل کر دیا جائے، صرف کنواری لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنے تصرف میں لے لیا جائے، اور دوسرا علاقہ وہ ہے جو بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں ہے، یہاں مردوں، عورتوں اور بچوں یہاں تک کہ ان کے چوپایوں کو بھی تہ تیغ کر دیا جائے۔

عیسائی حضرات خیال کرتے ہیں کہ ان کا مذہب جنگ و جدال کا مذہب نہیں ہے، گو آج پوری دنیا میں عیسائی اقوام ہی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں کی اصل ذمہ دار ہیں، لیکن مذہبی اعتبار سے بھی عیسائی حضرات یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا، صلح کرانے نہیں، بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔" (متی ۱۰: ۳۴، ۳۶)

ایک موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے متبعین کو یہ نصیحت بھی فرمائی کہ وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدیں۔ (لوقا ۲۲: ۳۶)

ہندو مذہب اپنے آپ کو اہنسا اور عدم تشدد کا مذہب کہتا ہے، گاندھی جی کا خیال ہے کہ ہندو مذہب کا سب سے بڑا حسن یہی ہے، لیکن ہندو مذہب کی تاریخ جنگوں سے بھری ہے، رامائن شری رام جی کے حالات اور رام اور راون کی بھیانک جنگ کی کہانی ہے، گیتا جس کو ہندو بھائیوں کے یہاں بڑا تقدس حاصل ہے، اور جس کو خود گاندھی جی اپنی ماں کہا کرتے تھے، وہ تمام تر کوروؤں اور پانڈوؤں کی داستان جنگ ہے، ہندوؤں کے عقائد

میں ایک آواگون بھی ہے، جس کے تحت ایک شخص موت کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے، اس کے پیش نظر شری کرشن جی ارجن سے کہتے ہیں کہ روح نئے جسم کی حیثیت کپڑے کی ہے، گویا قتل انسانی پرانا کپڑا پھاڑ کر نیا کپڑا پہنانے کے مترادف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی بری بات نہیں۔ شری کرشن جی مزید کہتے ہیں کہ جب ہر انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو آخر اسے مار ڈالنے میں کیا قباحت ہے؟ ظاہر ہے ان تعلیمات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ ہندو مذہب میں جنگ کا تصور نہیں ہے۔

اسلام نے بھی یقیناً جہاد کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو بھی غیر مسلم سامنے نظر آئے اس کی گردن مار دیں، بلکہ قرآن وحدیث کے ارشادات کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے: ذمی، معاہد، حربی۔

مسلم ملک کے غیر مسلم شہریوں کو "ذمی" کہتے ہیں، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ذمی کہنے میں ان کی تحقیر و تذلیل ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، ذمہ کے معنی عربی زبان میں "عہد" کے ہیں، اور ذمی وہ ہے جس سے مسلمانوں کا عہد ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن طریقے پر رہیں گے، اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت بھی کریں گے، گویا ان کو ذمی کہہ کر مسلمانوں کو ان کے متعلق ذمہ داریوں کو یاد دلانا مقصود ہے کہ وہ ان کی حفاظت اور حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں، ذمی کی جان و مال، عزت و آبرو، اور عام انسانی حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں۔

غیر مسلموں کی دوسری قسم وہ ہے جن کو "معاہدین" کہا جاتا ہے، یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں، اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن و ربط باہم کا معاہدہ ہو، یہ معاہدین بھی ذمی ہی کے حکم میں ہیں، ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا احترام اسی طرح واجب ہے جیسے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا، اور یہ بھی جائز نہیں کہ ان سے طے شدہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی جائے۔

غیر مسلموں کی تیسری قسم وہ ہے جن کو "حربی" کہا جاتا ہے، یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن اور ربط باہم کا معاہدہ نہ ہو

وہ ان طاقتوں کے برسر پیکار رہتے ہوں، جو اسلام اور انسانیت کے لئے خطرات بن رہے ہوئے ہوں، اسلام صرف ایسے ہی لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے غالباً سب سے پہلے جنگ کے مہذب اور شائستہ قوانین دیئے، اور آپ ﷺ نے اپنے فوجیوں کو نہایت اہمیت کے ساتھ ان اصولوں کا پابند رہنے کی تاکید فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: جو چرچ اور مذہبی عبادت گاہوں کے متعلقین ہوں، ان کو قتل نہ کیا جائے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو جنگ کے درمیان نشانہ بنایا جائے، آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ مقتولین کا "مثلہ" کیا جائے، اور ان کے اعضاء کاٹ دیئے جائیں، اس سے بھی منع فرمایا کہ کسی کو باندھ کر اسے نشانہ بنایا جائے، کسی کو نذر آتش کر دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوائے خدا کے کسی کو آگ میں جلانے کا حق نہیں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں شدید ضرورت کے بغیر آتشیں اور نیوکلیر ہتھیاروں کا استعمال درست نہیں، کیوں کہ یہ آتشیں ہتھیار ہیں، اور اس کی زد میں فوجیوں کے ساتھ ساتھ پرامن شہری بھی آ جاتے ہیں، جو جنگ میں شریک نہیں ہیں۔ جنگ کے موقع پر لوٹ مار اور چھینا جھپٹی ایک عام بات ہے، لیکن آپ ﷺ نے اس کو بھی منع فرمایا، آپ ﷺ نے فوجیوں کے لئے چلتے پھرتے ہوئے بھی آداب بتائے، شور و ہنگامہ کو منع کیا، اس طرح چلنے اور منزل پر پڑاؤ ڈالنے کی تلقین کی کہ مسافر دقت محسوس نہ کریں، راہ گیروں کو نقصان پہنچانے اور ڈرانے دھمکانے سے سختی سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے سفارتی آداب کی بھی پوری پوری رعایت فرمائی، مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن حارث حاضر خدمت ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔ واقعہ ہے کہ دنیا کو سب سے پہلے جنگ کے درمیان تہذیب و شائستگی، انسانی احترام اور احترام آدمیت کا سبق نبی عربی ﷺ نے دیا، اور یہ جو کچھ آج مشرق و مغرب میں قانون جنگ کا شور ہے اور جس کی سب سے زیادہ خلاف ورزی خود ترقی یافتہ قوموں کے ذریعہ ہوا کرتی ہے، یہ سب آپ ﷺ ہی کی مبارک تعلیمات کی بازگشت ہے۔

یہ تو وہ احکام جنگ ہیں جو عین جنگ کے درمیان اپنے دشمنوں کے ساتھ برتے

کے ہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح مند کرے تو آپ ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ نہایت فراخدلانہ سلوک کی تعلیم دی، اور عفو و درگذر کا راستہ اختیار کرنے کو فرمایا۔ اس سلسلے میں فتح مکہ کا واقعہ بہترین مثال ہے، اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر کیا کچھ مظالم نہیں ڈھائے؟ لیکن جب اللہ نے مسلمانوں کو فتح و سربلندی سے نوازا اور اہل مکہ کو ہزیمت ہوئی تو آپ نے انتقام لینے کے بجائے عام معافی کا اعلان کر دیا، ارشاد ہوا: لا تثریب علیکم الیوم، آپ ﷺ نے عفو و درگذر ہی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ آگے بڑھ کر ان کی عزت نفس اور تکریم کا بھی خیال رکھا، سردار قریش ابوسفیان کے بارے میں فرمایا: جو ان کے گھر میں پناہ لے لے وہ مامون ہے: من دخل دار ابی سفیان فھو آمن۔

غزوۂ بدر میں ستر قیدی بنائے گئے، تو آپ ﷺ نے ان کو اس شان و اعزاز کے ساتھ رخصت فرمایا کہ ان کے لئے جوڑے بھی سلائے، آپ ﷺ نے ان قیدیوں کو صحابہ پر تقسیم فرما دیا تھا، اور صحابہ کا حال یہ تھا کہ خود بھوکے رہ کر ان کو کھلاتے تھے، کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے، غزوۂ حنین کے موقع پر چھ ہزار دشمنوں کو گرفتار کیا گیا، لیکن آپ ﷺ نے بغیر کچھ لئے ہوئے ان سب کو رہا کر دیا — غور کیجئے! ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ حسن سلوک اور انسانیت پروری ہے، دوسری طرف یورپ کی شرافت اور انسانیت دوستی کا حال یہ ہے کہ نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کے سامان کو ایک بوجھ تصور کرتا تھا۔

اسلام کے تصورِ جہاد کے پس منظر میں اس بات کا ذکر مناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوات اور جہاد کے ذریعہ جو عظیم الشان انقلاب برپا کیا، اس میں کس قدر کم جانی نقصان ہوا، آپ ﷺ کے کل غزوات و سرایا کی تعداد بیاسی ہے، جن میں مسلمان شہداء کی تعداد دو سو انسٹھ اور غیر مسلم مقتولین کی تعداد سات سو انسٹھ ہے، اس طرح کل مقتولین دس سو اٹھارہ ہیں، گویا فی جنگ مقتولین کا اوسط ۱۱ سے کچھ زیادہ ہے۔

اب آپ اس کا تقابل ان انسانی ہلاکتوں سے کیجئے جو دوسری قوموں میں پیش آئی ہیں، ہندو تاریخ کے مطابق صرف مہابھارت کی جنگ میں لاکھوں لوگ کام آگئے، عیسائی

دنیا میں عیسائی نظام نے قرونِ وسطیٰ میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کئے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ان میں ۳۲ ہزار وہ بدقسمت ہیں جو زندہ جلا دیے گئے۔ بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو بلا امتیاز مرد وزن، بچے بوڑھے ستر ہزار مسلمان شہید کردیئے گئے، لیکن پھر اسی بیت المقدس پر جب دوبارہ مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو سلطان صلاح الدین ایوبی نے عفو عام کا اعلان کردیا، اور عیسائی چونکہ یہودیوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں تھے، اس لئے دونوں کی آبادیاں بھی الگ کردی گئیں۔ پہلی جنگ عظیم کے مقتولین کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق ۷۰ لاکھ کے قریب پہنچتی ہے۔

غور فرمایئے کہ جو لوگ تہذیب وتمدن کے مدعی ہیں اور اپنے آپ کو انسانیت کا علمبردار تصور کرتے ہیں، انہوں نے کس کس طرح انسانیت کی دھجیاں اڑائی ہیں! ان واقعات سے آپ کو یقیناً اس پروپیگنڈے کی حقیقت کا بھی اندازہ ہوا ہوگا، جو اسلام کے تصورِ جہاد اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے عملی جہاد کے بارے میں آج پوری دنیا میں جاری وساری ہے۔ افسوس کہ ہم مسلمان اپنی غفلت شعاری اور کوتاہ عملی کی وجہ سے دنیا کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنے اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت کی انسانیت نوازی کا پہلو پیش کرنے سے قاصر ہیں!

(۱۳ دسمبر ۲۰۰۲ء)

جہاد ـــــــ حقیقت اور فسانہ

انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ جو بات اس سے بار بار کہی جاتی اور اس کے سامنے دہرائی جاتی ہے، وہ اس کا یقین کر لیتا ہے، خواہ وہ بات کتنی ہی خلافِ واقعہ کیوں نہ ہو، اس کی ایک مثال اس وقت "جہاد" کے عنوان سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں بھی ہیں، مغربی ملکوں نے اپنے ظلم و زیادتی پر پردہ رکھنے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لئے "جہاد" کو دہشت گردی کے ہم معنی قرار دے دیا ہے، اور پوری دنیا میں اسلام کے خلاف دہشت گردی کو عنوان بنا کر مہم چلائی جا رہی ہے، اسرائیل فلسطین کی زمین پر قابض ہے، فلسطینی باشندوں کو اپنے گھر واپسی کے حق سے محروم کئے ہوئے ہے، اور خود یہودی بستیاں بسا رہا ہے، اسرائیل کا موجودہ وزیر اعظم ایریل شارون خون آشام طبیعت کا انسان ہے اور اس نے نہتے عربوں کا قتل عام کیا ہے، اس کے باوجود انہیں دہشت گرد نہیں کہا جاتا، اور فلسطینی جب ان مظالم کے خلاف جد و جہد کرتے ہیں تو ان کی مدافعانہ کارروائیوں کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خود ہمارے ملک ہندوستان میں جن طاقتوں نے علانیہ بابری مسجد کو شہید کیا، عدالتی احکام کی خلاف ورزی کی، بھاگلپور، میرٹھ اور مختلف علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور جو گجرات میں منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کی جان و مال کو تباہ کر رہے ہیں وہ دہشت گرد نہیں کہلاتے، اور اگر مسلمانوں کی طرف سے کسی ردِ عمل کا اظہار ہو تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے، انڈونیشیا میں مشرقی تیمور کے علاحدگی پسندوں نے شورش برپا کی تو انہیں دہشت گرد نہیں کہا گیا، اور انڈونیشیا کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ اس خطہ کو آزاد کر دے، اسے دہشت گردی نہیں سمجھا گیا، خود ان میں جنوبی علاقے

خلاف طاقت کا استعمال ، لیکن اس کے لئے کچھ شرطیں اور تفصیلات ہیں ، ایسا نہیں ہے کہ کسی مسلمان کی نظر جس غیر مسلم پر پڑ جائے یا جو غیر مسلم اس کی گرفت میں آجائے وہ اس کا کام تمام کردے ، یہ جہاد نہیں بلکہ فساد ہے ، جہاد کے سلسلہ میں قرآن نے ہمیں واضح طور پر بتایا کہ جو لوگ تم کو مرنے اور مارنے کے درپے ہوں تم بھی ان سے جہاد کرو ، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

" وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ " (البقرۃ : ۱۹۰)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہوں ، اور زیادتی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے ۔

اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ، اول یہ کہ جہاد کا — جس کو قرآن مجید میں قتال سے تعبیر کیا گیا ہے ، ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں ، جو مسلمانوں کے ساتھ جبر روا رکھتے ہوں ، ان سے قتال کا حق نہیں ہے ، ایک اور موقع پر قرآن مجید نے اس حکم کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے ، ارشاد ہے :

" لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ " (الممتحنہ : ۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہ کرتے ہوں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالتے ہوں ، اللہ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا ، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں ۔

یہ آیت صاف طور پر بتاتی ہے کہ جہاد کا حکم ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے آمادۂ جنگ ہوں ، اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوم سے جنگ و جدال کا تہیہ کئے ہوئی ہو

تو آخر ان سے جنگ نہ کی جائے گی تو کیا ان کے لئے پھولوں کی سیجیں بچھائی جائیں گی؟

اوپر جس آیت کا ذکر ہوا ہے، اس میں دوسری اہم بات یہ فرمائی گئی ہے کہ عین حالت جنگ میں بھی اس بات کی اجازت نہیں رہتی کہ مسلمان اخلاق اور انسانیت کی حدود کو پھلانگ جائیں، اسی کو قرآن مجید نے "اعتداء" یعنی "زیادتی" سے تعبیر کیا ہے، اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، علامہ ابن کثیرؒ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حسن بصری وغیرہ سے اس کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد دشمن کا مثلہ کرنا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا، مذہبی شخصیتوں کا قتل اور درختوں کو جلانا ہے، (تفسیر ابن کثیرؒ: ۱/۲۲۶) رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی انسان کو جلانے کی سزا دی جائے، کہ اس سزا کا حق صرف اللہ کو ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ اس ہدایت کو ملحوظ رکھا، انسانوں کو زندہ جلانے کی اہانت اور انسانیت سوز صورت یا تو ان عیسائیوں کے یہاں ملتی ہے، جن کی مذہبی عدالتیں عقیدہ سے اختلاف رکھنے والوں کو زندہ نذر آتش کر دیا کرتی تھیں، یورپ کی مذہبی اور اخلاقی تاریخ کی کتابوں میں بکثرت اس کا ذکر آیا ہے، دوسرے ہندوستان میں بیوہ عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ جرم بے گناہی میں زبردستی جلا دیا جاتا تھا، جسے ستی کا نام دیا جاتا تھا، یہی ظالمانہ روایت ہے جس کو ابنائے وطن اس وقت گجرات میں دہرا رہے ہیں۔

افسوس کہ مغربی ذرائع ابلاغ نے جہاد کے وسیع مفہوم کو صرف قتال میں محدود کر دیا ہے، اور اسلام کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے، جس میں رواداری، تحمل، قوت برداشت اور دیگر اہل مذہب کے ساتھ حسن سلوک کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو، بلکہ وہ چاہتا ہو کہ ہر "غیر مسلم" کو تہ تیغ کر دے، یہ تصور جہاد کی نہایت ہی غلط اور خلاف واقعہ توضیح ہے، جو اسلام کے سر ڈال دی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی غیر مسلموں کے تین طبقے ہیں، ایک تو وہ غیر مسلم جو مسلم ممالک میں آباد ہوں، ان کو "ذمی" یا "اہل ذمہ" کہا جاتا ہے، دوسرے وہ غیر مسلم جن کے ساتھ اقتدار میں شرکت اور بقاء باہم کے اصول پر مسلمان ایک ملک میں رہتے

ہیں، اس طرح ان غیر مسلموں کے لئے فقہاء کے یہاں "معاہد" کی تعبیر ملتی ہے، یعنی وہ شخص جس سے عہد ہو چکا ہے، ان دونوں سے جہاد نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی جان و مال کو مسلمانوں ہی کی جان و مال کی طرح قابل احترام قرار دیا ہے: "دماءهم كدمائنا و أموالهم كأموالنا" ہاں اگر یہ مسلمانوں پر زیادتی کریں تو اپنی مدافعت کرنا اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان سے ظلم کا بدلہ لینا جائز ہے، اور دنیا کے ہر قانون میں انسان کے لئے اس حق مدافعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

جہاد ان لوگوں سے ہے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہ ہو، جو مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکتے ہوں، اور انہیں ان کے وطن سے بے وطن کرنا چاہتے ہوں، جیسا کہ اس وقت اسرائیل فلسطینیوں یا سرب بوسنیائی مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کے خلاف اسلام نے قتال کی اجازت دی ہے، اور یہ صرف اسلام کی بات نہیں، دنیا کے تمام مذاہب اور مہذب قوانین میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ جب کوئی قوم دوسری قوم پر زیادتی کرے تو اسے مدافعت اور جنگ کی اجازت ہے، اور ان سے جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔

آج دنیا کی بہت سی قومیں بلا وجہ محض مادی وسائل پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے دوسری قوموں پر حملہ زن ہو رہی ہیں، اور ایسے مہلک اسلحہ استعمال کر رہی ہیں، جن کی ہلاکت خیزیاں حساب و شمار سے باہر ہیں، بلا دلیل و ثبوت اپنے مخالفین کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے اور بے مقصد جنگیں مسلط کر دی جاتی ہیں، لیکن اسے دہشت گردی نہیں کہا جاتا، اور مظلوم کی آہ و فغاں کو بھی سرکشی اور دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ کس قدر غیر منصفانہ اور نامعقول رویہ ہے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود جہاد کی حقیقت سے واقف ہوں، اس بات کو جاننے کی کوشش کریں کہ جہاد کیا ہے؟ جہاد کن قوموں سے ہے؟ اور جہاد کا موقع و محل کیا ہے؟ آج اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں اور جو زہر لوگوں کے ذہن میں بھی پیوست کیا جا رہا ہے، وہ پوری بصیرت کے ساتھ اس کا جواب دے سکیں۔

اور لوگوں کو زہر کا تریاق فراہم کر سکیں، افسوس کہ اسلامی لٹریچر سے بے توجہی اور اسلام کے بارے میں حد درجہ ناآگہی کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم دوسرے کی غلط فہمی تو کیا دور کرتے کہ خود بھی ان پروپیگنڈوں سے متأثر اور مرعوب ہوتے جاتے ہیں، اور خود ہمارا ذہن شکوک واشتباہات کی تاریکی میں پست ہوا جاتا ہے، ہمیں ایسے مسائل و موضوعات پر قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا چاہئے، سلف کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے، اور اصحاب نظر علماء سے صحیح صورت حال کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے!

(۲۶؍ اپریل ۲۰۰۴ء)

اسلام —— دینِ اعتدال

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، عام طور پر ان میں افراط و تفریط انسان کے لئے ناگوار خاطر اور دشوار ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کے لئے مفید ترین چیزیں بھی اگر حد اعتدال سے بڑھ جائیں یا حد ضرورت سے کم ہو جائیں تو انسان کے لئے رحمت بننے کے بجائے زحمت اور انعام خداوندی کے بجائے عذاب آسمانی بن جاتی ہیں، ہوا انسان کے لئے کتنی بڑی ضرورت ہے؟ لیکن جب آندھیاں چلتی ہیں تو یہی حیات بخش ہوا کتنی ہی انسانی آبادیوں کو تخت و تاراج کر کے رکھ دیتی ہیں، پانی زندگی و حیات کا سرچشمہ ہے، لیکن جب دریاؤں کی متلاطم موجیں اپنے دائرے سے باہر آجاتی ہیں تو کس طرح سبزہ زار کھیتوں اور شاد و آباد بستیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتی ہیں، قدرت کی اکثر نعمتوں کا یہی حال ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام اعتدال پر رکھا ہے، مثلاً ایک زمین کے نظام کشش ہی کو لے لیجئے، زمین میں جو قوت کشش اس وقت موجود ہے، اگر اس سے بڑھ جائے تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کا قد و قامت بلی اور چوہے کی طرح ہو جائے، اور گھٹ جائے تو انسان اونچے درختوں بلکہ تاڑ کے درختوں کے ہم قامت ہو جائے، غور کیجئے کہ اگر انسان کا قد اتنا چھوٹا یا اتنا بڑا ہو جائے تو یہ کتنی پریشان کن بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے سورج اور زمین کے درمیان ایک متوازن فاصلہ رکھا ہے، یہ فاصلہ بڑھ جائے تو زمین برف سے ڈھک جائے گی اور گھٹ جائے تو زمین پر ناقابل برداشت گرمی ہوگی، قدرت کا پورا نظام اعتدال پر قائم ہے، اور یہ ترازو رب کائنات نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اسی لئے قرآن نے اللہ تعالیٰ کو "رب العالمین" قرار دیا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو اعتدال پر قائم فرمایا ہے، اسی طرح اللہ اپنے بندوں سے بھی اعتدال چاہتے ہیں، اور افراط و تفریط کو ناپسند فرماتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عدل کا حکم دیتے ہیں (إن الله يأمر بالعدل) عدل کی روح اعتدال ہے، اور جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا ہی انسان کو ظلم کی طرف لے جاتا ہے، اعتدال زندگی کے کسی ایک شعبہ سے متعلق نہیں، بلکہ یہ زندگی کے ہر مرحلہ میں مطلوب ہے، قرآن وحدیث پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گفتار و رفتار، خوشی و غم، سلوک و برتاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہر شعبۂ زندگی میں افراط و تفریط ناپسندیدہ ہے، اور اعتدال مطلوب ومحبوب ہے۔

اگر انسان چل رہا ہو تو اس کی رفتار معتدل ہونی چاہئے، اور اس میں اترانے کا انداز نہیں ہونا چاہئے، یہ چال کا اعتدال ہے، قرآن کہتا ہے کہ تم زمین میں اترا کر نہ چلو، کہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑ کی بلندیوں کو چھو سکتے ہو: (ولا تمش في الأرض مرحا إنك لن تخرق الأرض ولن تبلغ الجبال طولا (الإسراء: ۳۷) بول چال میں اعتدال چاہئے، نہ ایسی پست آواز ہو کہ مخاطب سن بھی نہ سکے، نہ اتنی بلند ہو کہ حد اعتدال سے گذر جائے، قرآن کہتا ہے کہ آواز حسب ضرورت پست ہونی چاہئے، گدھے کی آواز بہت بلند ہوتی ہے، لیکن سب سے ناپسندیدہ: (واغضض من صوتك، إن أنكر الأصوات لصوت الحمير (. . .)

لباس و پوشاک میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لباس کو پسند نہیں فرمایا جس کے پیچھے جذبۂ تفاخر کارفرما ہو، آپ خود سادہ لباس استعمال فرماتے اور آپ ﷺ نے سادہ لباس استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، لیکن یہ بھی مقصود نہیں کہ آدمی ایسے پھٹے کپڑے پہنے جو اس کے مصنوعی فقر کا مظہر ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت سے سرفراز فرمائے، تو اس پر اس نعمت کا اثر نظر آنا چاہئے، غرض کہ نہ افراط ہو اور نہ تفریط، ایک طرف آپ ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا بتاکید حکم فرمایا، (ترمذی، حدیث نمبر ۲۷۶۳) دوسری طرف حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ سے مروی ہے کہ چہرے کی چوڑائی اور لمبائی والے حصہ

ے آپ ﷺ آہستہ آواز میں ترنما بھی کرتے تھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر ۴۴۷)

دعا کے بارے میں فرمایا کہ آواز بہت بلند نہ ہو بلکہ ایک حد تک پست ہو، بہت بلند آواز میں دعا کرنے کو زیادتی قرار دیا گیا: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (الاعراف ۵۵) بالغ لڑکی کو خود اپنے نکاح کا ولی بنایا، ارشاد ہے کہ بے شوہر خاتون بہ مقابلہ ولی کے خود اپنی ذات کی زیادہ حقدار ہے۔ (ابو داؤد، حدیث نمبر ۲۰۹۸) لیکن چوں کہ ولی کی شرکت کے بغیر عورت کی ناتجربہ کاری اسے نقصان پہنچا سکتی ہے، اس لئے یہ بھی قرار دیا گیا کہ ولی کی شرکت کے بغیر نکاح کا انعقاد بہتر نہیں: لا نکاح الا بولی (ابو داؤد، حدیث نمبر ۲۰۸۵)

اگر کوئی شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو تو حکم فرمایا گیا کہ مقتول کا ولی قاتل سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ بھی قاعدہ قانون اور اصول کے دائرہ میں ہو، اور قتل میں حدود سے تجاوز نہ ہو: **ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل** (الاسراء ۳۳) انفاق اسلام میں کس قدر مطلوب اور پسندیدہ عمل ہے؟ لیکن قرآن نے یہاں بھی اعتدال پر قائم رہنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لو اور نہ اتنا خرچ کرو کہ خود تمہارے لئے حسرت اور لوگوں کی ملامت کا سبب بن جائے: **ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطها کل البسط فتقعد ملوما محسورا** (الاسراء ۲۹) ایک صحابی اپنی پوری جائداد اللہ کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے تو آپ ﷺ نے اعتدال کا حکم دیا اور غلو کو منع فرمایا، حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ مسلسل روزے رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے، آپ ﷺ کو علم ہوا تو ناپسندیدگی ظاہر کی، اور فرمایا: کبھی روزے رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، کیوں کہ تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہارے بدن کا بھی، اور تمہاری بیوی کا بھی۔ (بخاری، حدیث نمبر ۱۹۷۷) اسی طرح کی بات آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون ؓ سے بھی ارشاد فرمائی۔ (دیکھئے: ابو داؤد، حدیث نمبر ۱۳۶۹) اگر کسی شخص کو روزہ رکھنے کی طرف بڑی رغبت ہو تو اسے صوم داؤدی رکھنے کا حکم دیا گیا، یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کرنے کا حکم ہوا، حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل

یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور اگلے دن نہیں رکھتے، آپ ﷺ نے اسی کو روزہ رکھنے کا سب سے معتدل طریقہ قرار دیا: وهو اعدل الصيام وهو صيام داؤد،

(ابوداؤد، حدیث نمبر ۲۴۲۷)

حلال وحرام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اعتدال کا حکم فرمایا، جہاں اس بات کو منع کیا گیا کہ آدمی حرام کو اپنے لئے حلال کرلے، وہیں یہ بھی حکم فرمایا گیا کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو، دین میں غلو کا راستہ اختیار کرتے ہوئے حلال کو بھی حرام نہ کرلیا جائے، وَلَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (المائدہ: ۸۷) جہاد میں دین و ایمان اور نفس وجان کا مقابلہ دشمن سے ہوتا ہے، لیکن اس موقع پر بھی راہِ اعتدال کی رہنمائی کی گئی کہ جو تم سے برسرِ جنگ ہو تمہاری جنگ ان ہی لوگوں تک محدود ہونی چاہئے، اور اس سے آگے تجاوز نہیں کرنا چاہئے: وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرۃ: ۱۹۰) انسان جوشِ انتقام میں جادۂ انصاف سے ہٹ جاتا ہے اور حد اعتدال سے گذر جاتا ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ اگر کسی نے تم پر ظلم کیا ہو تو تمہارے لئے اس کے ظلم کے بقدر ہی اقدام کی گنجائش ہے، جواب میں تمہارے لئے انصاف کے دائرہ سے آگے بڑھ جانا درست نہیں۔ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ

(البقرۃ: ۱۹۴)

جب نفرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور کسی گروہ کی طرف سے زیادتی کا واقعہ پیش آتا ہے تو فطری طور پر غضب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اور یہ آگ انصاف کے تقاضوں کو سوکھے تنکوں کی طرح جلا کر رکھ دیتی ہے، قرآن نے خاص طور پر تاکید کی کہ گو اعداء اسلام نے تمہیں مسجد حرام سے روک رکھا ہے، لیکن ان کی یہ برائی بھی تمہیں انصاف کا دامن چھوڑ دینے اور انتقام کی نفسیات سے مغلوب ہو کر تمہارے آمادۂ ظلم ہو جانے کا باعث نہ بنے، (المائدہ: ۲) —— تنقید اور احترام میں بھی میانہ روی مطلوب ہے، یہ بہتر نہیں کہ کسی کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے اس کی ذاتیات کو بھی نشانہ بنایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کیا، اور اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ احترام میں غلو کی

صورت پیدا ہو جائے، اسی لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے اور کسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکانے سے منع کیا گیا۔

عام طور پر دو چیزیں انسان کو راہِ اعتدال سے منحرف کرتی ہیں، محبت اور عداوت، محبت انسان سے بصیرت ہی نہیں، بصارت بھی چھین لیتی ہے، اور وہ اپنے محبوب کی برائیوں میں بھی بھلائیاں نظر آتی ہیں، یہی حال نفرت و عداوت کا ہے، دشمن میں رائی جیسی برائی ہو تو وہ پہاڑ محسوس ہوتی ہے، اور پہاڑ جیسی خوبی ہو تو وہ رائی سے بھی حقیر نظر آتی ہے، اسلام سے پہلے جو قومیں گمراہ ہوئی، ان کی گمراہی کا باعث یہی بے جا غلو آمیز محبت، یا انکار و نفرت، اسلام نے اسے اس میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے، دشمن بھی ہو تو اس کی غیبت اور بہتان تراشی سے منع فرمایا گیا، دوست اور مرکزِ عقیدت ہو تب بھی اس کی تعریف میں غلو اور مبالغے اور تملق و خوشامد کو ناپسند کیا گیا، قرآن مجید نے بتایا ہے کہ کسی سے عداوت ہو تو اس کو بھی حدِ اعتدال سے باہر جانے نہ دے، ممکن ہے کہ کل ہو کر اللہ تعالیٰ تمہارے اور اس کے درمیان محبت پیدا فرما دے! عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً (الممتحنہ: ۷) رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ سے مزید واضح فرمایا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اپنے دوست سے حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے دوستی کرو، بعید نہیں کہ کسی دن وہی تمہارا دشمن بن جائے، اور اپنے دشمن سے بھی بغض میں اعتدال رکھو، کیا عجب کہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے۔ (ترمذی، حدیث نمبر ۱۹۹۸) غرض کہ دوستی اور دشمنی میں بھی اعتدال ہو۔

جو قوم دنیا کے لئے عدل اور اعتدال کی امانت لے کر آئی تھی، اور جس سے دنیا کی قوموں نے میانہ روی کا سبق سیکھ کر تہذیب و ثقافت کی منزلیں طے کیں اور شہرت و ناموری کے بامِ کمال تک پہنچیں، آج وہی امت افراط و تفریط، بے اعتدالی اور غلو کا عنوان بن گئی ہے، زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جس میں ہم نے بے اعتدالی کو اختیار نہیں کیا، تعمیری کاموں میں ہمارا بخل اور بے فائدہ کاموں میں ہماری فضول خرچی، دونوں کی مثال نہیں ملتی۔ احترام و عقیدت میں ذرہ کو آفتاب بنا دینا اور اختلاف و عداوت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو

مجسمہ کا انہدام ـــــ غور وفکر کے چند پہلو

افغانستان دو ہزار سال پہلے بودھوں کے زیر حکومت تھا، اس وقت بودھوں نے اس خطہ کے مختلف شہروں میں بودھ کے مجسمے تعمیر کئے تھے، پہاڑوں کو تراش کر تصور و خیالات تیار کرنا اور مجسمے بنانا اس عہد کا خاص فن تھا، اور خاص کر وسط ایشیا کے علاقے میں بودھوں نے اس کو بہت فروغ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ افغانستان کا شہر بامیان کسی زمانہ میں بودھ حکومت کا دارالحکومت تھا، چنانچہ اس شہر میں دو نہایت ہی عظیم الشان اور دیوہیکل مجسمے جن کی بلندی ۵۳ اور ۳۸ میٹر ہے، اونچی پہاڑیوں سے تراش کر بنائے گئے تھے، اس وقت طالبان نے پورے ملک افغانستان سے مجسموں کے انہدام اور انہیں بے نام و نشان کر دینے کی کارروائی شروع کی ہے، یہ دونوں مجسمے اس کی زد میں ہیں، اس کارروائی نے پوری دنیا میں ایک آگ سی لگادی ہے، مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سے اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، ہمارا ملک ہندوستان جو اپنے ملک میں ہونے والی بڑی سے بڑی زیادتی کو بھی داخلی مسائل کا نام دے کر دوسروں کے اعتراض کو رد کرنے کا عادی ہے، وہ بھی اس کے خلاف بیان بازی میں پیش پیش ہے اور مسلم ممالک جن کا رویہ ہمیشہ سے مسلمانوں کے مسائل میں نہایت ہی بزدلانہ ہوا کرتا ہے، وہ بھی اس موقع پر طالبان کو اپنی "نصائح" سے مستفید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا انصاف کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے، طالبان کے اس اقدام میں کئی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور عالمی طاقتوں کا رویہ کیا عدل پر مبنی ہے؟ ایسے مسائل میں دوہرا رویہ اختیار کیا جاتا ہے؟ دوسرے ہمارا ملک ہندوستان یا بودھوں سے واقعی محبت

عدل و انصاف سے آشنا ہے، اور اس ملک کی وحدت کو برقرار رکھنا ان کا پیش نظر ہے، اور یہ صرف ان کی فوجی طاقت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ انصاف و مساوات کے ساتھ تھی، اور امن سے بے قرار عوام ہر جگہ ان کے استقبال کے لئے چشم براہ تھے۔ انصاف اور معقولیت کا تقاضہ یہ تھا کہ طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا جاتا، اور انہیں عالمی اداروں میں نمائندگی دی جاتی، ایسی صورت میں افغانستان سے دنیا بھر کے روابط برقرار رہتے، اور ان سے مسائل پر گفتگو کرنا ممکن ہوتا! لیکن جو لوگ آج دوسروں پر آہ و زاری کر رہے ہیں، انہوں نے خود اس دروازے کو بند کر رکھا ہے جس سے کوئی مصالحتی گفتگو کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔

ہمارے ملک ہندوستان کے لئے ایک محب وطن کی حیثیت سے یہ مشورہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے، بابری مسجد چار سو سال قدیم مسجد تھی، جس میں نمازوں کا سلسلہ جاری تھا، اور جہاں پہلے مندر ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں، اسے علانیہ شہید کر دیا گیا، اور جن بدبختوں نے مسجد کو شہید کیا، وہ آج تک قانون کی زد سے بچے ہوئے ہیں۔ اور اب تک اس ظلم و ناانصافی کی تلافی کی طرف کوئی قدم بھی نہیں اٹھایا گیا تو جو لوگ ایک ایسی عبادت گاہ کو منہدم کرنے کے مجرم ہوں جس میں عبادت کرنے والے لوگ اس ملک بلکہ اس شہر میں بالفعل بھی موجود ہوں، وہ ایک ایسے مجسمے کے انہدام پر اعتراض کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ کہ اس ملک میں اس مذہب سے تعلق رکھنے والا ایک شخص بھی اب موجود نہیں۔

پھر ہندوستان کو خود اپنے ماضی کے داغ پر بھی نظر کرنی چاہئے، اور سوچنا چاہئے کہ بودھوں پر ہندوؤں سے بڑھ کر کسی قوم نے مظالم ڈھائے ہیں، ہندوستان تو پورا ملک ہی بودھوں کا تھا، ہندوؤں اور آریاؤں نے ان پر ایسے مظالم ڈھائے کہ انہیں ہندوستان چھوڑ کر چین، جاپان، کمبوڈیا، برما اور سری لنکا وغیرہ کے علاقوں کی پناہ لینی پڑی، یہاں تک کہ بعض بودھ مندروں پر آج بھی ہندو فرقہ پرستوں نے قبضہ کر رکھا ہے، اجنتا اور ایلورا کے غار جن میں بودھ عبادت گاہیں تھیں، وہ بودھوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے جور و ستم پر گواہ ہیں۔ کہ بودھ مذہب جب ترک وطن پر مجبور ہو گئے تو انہوں نے اپنی ان عظیم الشان

خانقاہوں کو مٹی سے بند کرا دیا تا کہ وہ ان کے دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رہیں، یہ بھی دلیری کی انتہا ہے کہ آپ نے جس قوم کو نشانہ بنایا ہے، دشمن کے نام سے ہولی کھیلی اور جنہیں ترکِ وطن پر مجبور کر دیا، آپ ان مظالم پر خود شرمندہ ہونے کے بجائے دوسروں کو زیادتی کا طعنہ دیں، اور اپنے آپ کو اس قوم کے ایک ہمدرد اور بہی خواہ کی حیثیت سے پیش کریں، واقعہ ہے کہ ہندوستان جب تک بابری مسجد کے مسئلہ میں اپنی ذمہ داری کو پوری نہ کر لے اس کو یہ بات بالکل زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے مسائل پر اظہارِ خیال کرے۔

جہاں تک اس مسئلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو دو باتیں بالکل واضح ہیں۔ اول یہ کہ اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے، اور ایک مسلمان کے لئے شرک کسی بھی درجہ میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، جیسے ایک غیرت مند شوہر بیوی کی ہر کمزوری کو سہہ سکتا ہے، اور ہر ناز کو برداشت کر سکتا ہے، لیکن اس کی بدچلنی کو گوارا نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک صاحبِ ایمان کے لئے خدا کے ساتھ شرک کا معاملہ قطعاً ناقابلِ برداشت ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں شرک کو اسی تمثیل سے سمجھایا ہے، جو قوم پہلے سے شرک میں مبتلا ہو، اس کے لئے نئے خداؤں کو وجود میں لانا یا کسی نئی طاقت کو خدا مان لینے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں، کیوں کہ اگر کوئی شخص سو خداؤں کو مانتا ہو تو ۱۰۱ واں خدا اس کے عقیدہ کو متاثر نہیں کرتا! بلکہ شاید ان کو خوشی ہی ہو کہ ایک اور بھگوان ہاتھ آگیا ہے، اسی لئے ہندو بھائی یہ پیشکش کرتے رہے ہیں کہ جہاں ہم اور بھگوانوں کی پرستش کرتے ہیں، محمد (ﷺ) کی پرستش کرنے کو بھی تیار ہیں، والعیاذ باللہ، لیکن جو شخص ایک خدا پر ایمان رکھتا ہو، اور اس ایک کے ماسوا سبھوں کا انکار کرتا ہو، اس کے لئے مختلف چوکھٹوں پر سر جھکانے اور مختلف آستانوں پر جبینِ بندگی خم کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں، اور اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان اس کی جرأت کرے تو وہ مسلمان باقی ہی نہیں رہتا، یہ عقیدہ توحید اتنا معقول اور قانونِ فطرت سے ہم آہنگ اور مدلل ہے کہ جو لوگ شرک کے مرتکب ہیں، وہ بھی تھوڑی سی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد خدا کی وحدت کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں پاتے، یہ عجیب بات ہے کہ انسان اپنے معاملہ میں تو اس قدر غیرت مند ہو کہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی

یا خود اپنی ذرا بھی غلط نسبت کو برداشت نہیں کرے، لیکن اپنے خالق و مالک کے معاملہ میں اس قدر بے غیرت اور تساہل سے عادی، کہ ہر ان سنے خالق و مالک کی اپنے ہاتھوں تحقیر کرتا جائے اور اس مسئلہ پر غور و فکر کے لئے بھی تیار نہ ہو۔

دوسرا اصول مذہبی رواداری اور دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت کا ہے، رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ اس بات پر قادر تھے کہ یہودیوں کی مذہبی عبادت گاہ کو منہدم کردیتے، لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شام اور فلسطین کا علاقہ فتح ہوا، جہاں عیسائیوں کے بڑے چرچ اور کنیسے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے حال پر رکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب فتح بیت المقدس کے موقع سے وہاں تشریف لے گئے اور کلیسا کے متولی کی اجازت بلکہ خواہش پر ایک چرچ میں نماز ادا کی، تو پھر اسی چرچ کے لئے ایک خصوصی دستاویز مرحمت فرمائی، کہ کہیں مسلمان اس کو مسجد میں تبدیل کردینے کی کوشش نہ کریں، اس کے بعد متولیان چرچ کی خواہش کے باوجود آپ نے چرچ میں نماز ادا نہیں فرمائی کہ مسلمان جبراً اس کو اپنی عبادت گاہ بنانے کی کوشش کریں گے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں سے پیشکش کی کہ من مانی قیمت لے کر مسجد کو دے دیں، تاکہ مسجد کے صحن کو وسعت دی جاسکے، مگر عیسائیوں نے نہیں مانا تو آپ خاموش ہو گئے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے تھے کہ مفتوحہ علاقوں میں کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، مصر کا علاقہ جہاں اہرام مصر واقع ہے، اور جن میں فرعون کے مجسمے بھی ہیں، عہد فاروقی ہی میں فتح ہوگیا، لیکن مسلمانوں نے عہد شرک کی ان یادگاروں کو منہدم کرنے اور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ آثار عالم مصر کی زمین پر موجود ہیں، یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، خود افغانستان کا علاقہ ابتدائی دور ہی میں فتح ہوا ہے اور تقریباً چودہ سو سال سے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، افغانستان میں تو توقع ہے کہ بعض صحابہ نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہوگا، تابعین تو بہت سے آئے ہوں گے، اور اولیاء صالحین تو وہاں کثرت سے پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن ان

حضرات نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع سے بیت اللہ شریف کے بتوں کو منہدم فرمایا، اور مکہ میں جہاں کہیں بھی بت تھے، انہیں صاف کرنے کا حکم دیا، لیکن یہ ایک استثنائی واقعہ ہے، مکہ دین توحید اسلام کا اعتقادی دار الخلافہ ہے، اس لئے ضروری تھا کہ یہاں شرک کے مظاہر باقی نہ رہیں، پھر اس شہر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بسایا تھا، اور اس گھر کو خالصۃً ایک اللہ کی عبادت کے لئے اللہ کے ان دو بندوں نے بنایا تھا، اس طرح یہ ابتداء ہی سے توحید کا مرکز تھا، جسے ناروا طریقہ پر بت پرستی کا مرکز بنانے کی کوشش کی گئی تھی، اس لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ قدم اٹھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت طالبان کا یہ اقدام مصلحت وقت کے خلاف اور ان لوگوں کو موقع مہیا کرنے والا ہے جو مسلمانوں کو دہشت گرد اور شدت پسند بتاتے ہیں، اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی نفرت انگیز غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں، دوسری طرف ایک ایسا ملک جو صد فی صد مسلمان ہے، اور جہاں ان مجسموں کی پہلے سے بھی کوئی پذیرائی نہیں تھی، وہاں ان کا باقی رہنا چنداں مضر نہیں تھا۔ ان حالات میں اس رواداری اور وسیع النظری کی راہ کو اختیار کرنا بہتر ہوتا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ اور مسلمانوں کی تاریخی روایات کے مطابق ہے، ورنہ اس طرح کا عمل بسا اوقات رد عمل کو جنم دیتا ہے، اور یہ ہرگز بہتر بات نہ ہوگی کہ کوئی مسلمان ناشائستہ رد عمل کا سبب بنے، قرآن نے اسی لئے معبودان باطل کو برا بھلا کہنے سے منع کیا، کہ اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ بھی جواب میں شان باری تعالیٰ میں گستاخی کے مرتکب ہوں گے اور بالواسطہ طریقہ پر ہم اس کا سبب بنیں گے۔

(۱۶ مارچ ۲۰۰۱ء)

کیا کافر کہنا توہین ہے؟

کوئی انسان خود اپنی مرضی اور خواہش سے دنیا میں پیدا نہیں ہوا ہے، اور نہ کوئی شخص اپنی خواہش اور مرضی سے دنیا سے واپس ہوتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی اور طاقت ہے جو انسان کو دنیا میں بھیجتی ہے، اور ایک مقررہ وقت کے بعد اسے واپس بلا لیتی ہے، یہ کون سی طاقت ہے؟ اس سلسلہ میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سب اس فطرت کی کرشمہ سازی ہے جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے، جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں اور ملحد و دہریے ہیں، کائنات کے وجود اور اس کے بقاء کے سلسلہ میں ان کا یہی نقطۂ نظر ہے، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فطرت کو بھی ایک خالق کی ضرورت ہے، جس نے مختلف چیزوں میں الگ الگ صلاحیتیں رکھی ہیں، ایسا کیوں ہوا کہ آگ جلاتی ہے، اور پانی ٹھنڈک دیتا ہے؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ آگ ٹھنڈی ہوتی اور پانی گرم ہوتا، آفتاب کی فطرت میں سرخی اور ماہتاب کی فطرت میں سفیدی رکھی گئی، بکری ایک مسکین طبیعت جانور ہے اور شیر درندہ صفت، یہ اختلافِ فطرت کیوں ہے؟ پھر اگر زندگی اور موت فطرت کے تابع ہوتی ہر شخص کو ایک متعینہ وقت پر ہی موت آتی، ہر شخص ایک مقررہ وقت پر ہی باپ بنتا، لیکن ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس قانونِ فطرت کا بھی کوئی خالق ہے، جس کے سامنے فطرت سرِ تسلیم خم کئے ہوئی ہے، اور جو پل پل اس کے تصرف کی تابعدار ہے، اسی ان دیکھے وجود کا نام "خدا" ہے، خدا کے ماننے والوں کے مقابلہ خدا کا انکار کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ معمولی اور انگلیوں پر قابل شمار رہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا یقین گویا خود فطرتِ انسانی کا ایک حصہ ہے، دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں، تقریباً یہ بات سب کے درمیان قدر مشترک ہے۔

جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں وہ اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ ان کو اسی طریقہ کو اپنانا چاہئے جو خدا کی طرف سے ان کے لئے مقرر کیا گیا ہو، کیوں کہ جو کسی مشین کو بناتا اور وجود میں لاتا ہے اسی کی ہدایت کے مطابق وہ چیز استعمال بھی کی جاتی ہے، خدا کے بتائے ہوئے طریقۂ زندگی کا نام "دین" ہے اور اسی کو لوگ "مذہب" سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دو متضاد چیزیں بیک وقت درست نہیں ہو سکتیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دن اور رات ایک ہی ہے، روشنی اور اندھیرا جداگانہ حقیقتیں نہیں ہیں، میٹھا اور نمکین ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، تو یہ بات یقیناً سچائی کے خلاف ہوگی۔ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی کو میٹھا پسند ہو تو نمکین پسند کرنے والوں کو بُرا بھلا نہ کہے، اگر کسی کو اندھیرا بھاتا ہو تو وہ روشنی پسند کرنے والوں سے الجھے نہیں، لیکن یہ کہنا کہ روشنی اور اندھیرا دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے یقیناً ایک خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ بات ہوگی۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل دین ایک ہی ہے، اسی دین کو لے کر پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اس کائنات میں اترے، اسی کی دعوت حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی، اسی نعرۂ حق کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انبیاء بنی اسرائیل نے اپنے اپنے عہد میں بلند فرمایا، ہر قوم اور ہر زبان میں اسی صراطِ مستقیم کی سوغات لے کر انبیاء و رسل پہنچے، جس کا سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوا، إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران ۱۹)۔ اس لئے اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا، خدا نے کھانے کے لئے الگ نالی بنائی ہے، اور سانس لینے کے لئے الگ نلی، اگر کوئی شخص سانس کی نالی میں کھانے کا لقمہ دے دے تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے، اسی طرح نجات کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے، یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، بظاہر ایک اچھا نعرہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ تمام دواؤں کا ایک ہی اثر ہوتا ہے۔

جو لوگ مذاہب کے بارے میں اتحاد کی بات کہتے ہیں، وہ دراصل مذہب کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں، جو لوگ ایک خدا کو مانتے ہوں، جو تمام خداؤں پر یقین رکھتے ہوں،

اور جو تین کروڑ خداؤں کے سامنے سر جھکاتے ہوں، یہ سب برابر کیسے ہو سکتے ہیں، اور کیوں کر سوچا جا سکتا ہے کہ بیک وقت یہ تمام باتیں درست ہوں گی؟ جن لوگوں نے خدا کی طاقت کو مختلف لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، اور جن کے نزدیک خدا قادرِ مطلق ہے، اس کی طاقت میں کوئی شریک و سہیم نہیں، یہ دونوں سچائی پر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لئے یہ کہنا کہ تمام مذاہب حق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

ایسی صورت میں ہر مذہب کو اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے لئے کوئی نہ کوئی تعبیر اختیار کرنی ہوتی ہے، اس تعبیر کے لئے ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جو دوسرے مذہب پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں، ان کے لئے اہانت آمیز لفظ استعمال کیا جائے، جیسے ہندو مذہب کی بعض کتابوں میں غیر ہندو کے لئے ملیچھ (ناپاک) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دوسروں کے لئے اہانت آمیز تعبیر ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک تعبیر اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے ہو اور ایک اس کے نہ ماننے والوں کے لئے، جس کا مقصد ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہو، اکثر آسمانی کتب میں یہی صورت اختیار کی گئی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو یہود کی نسبت سے یہودی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے عیسائی کہا گیا اور تورات وانجیل میں اس زمانے کے اس دینِ حق پر ایمان نہ رکھنے والوں کے لئے "کافر" کا لفظ استعمال کیا گیا اور اس انکار کو "کفر" کہا گیا۔

یہی تعبیر آخری، مکمل اور محفوظ کتابِ ہدایت قرآن مجید میں بھی اختیار کی گئی ہے، جو لوگ اس کی تعلیمات پر یقین رکھنے والے ہیں ان کو "مسلم" یا "مومن" کہا گیا، یعنی احکام اسلام کو ماننے والا اور اسلامی تعلیمات پر یقین رکھنے والا، اور اس کے انکار کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، چنانچہ قرآن مجید میں دینِ اسلام سے انحراف اور اس انحراف پر یقین رکھنے والوں کے لئے مختلف صیغوں میں کفر اور کافر کا لفظ ۵۲۵ بار استعمال کیا گیا ہے، مگر یہ کوئی نئی تعبیر نہیں ہے۔

عربی زبان میں کفر کے اصل معنی چھپانے کے آتے ہیں۔ اسی لئے رات کے لئے
بھی کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ وہ بھی اپنے پردۂ ظلمت میں لوگوں کو چھپاتی ہے۔
کاشتکار چونکہ بیج کو زمین کی تہہ میں چھپا دیتا ہے، اس لئے عربی زبان میں کاشتکار کو بھی
بعض اوقات کافر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (مفردات القرآن ۲/۵۵۵)۔ غالباً اسی مناسبت
سے یہ لفظ سمندر اور اندھیرے بادل کے لئے بھی استعمال ہوا ہے (القاموس المحیط ۲/۱۲۸)۔
کہ سمندر اپنی تہوں میں کئی قسم کی معدنیات و نباتات کو چھپائے ہوئے ہے، اور گھنا بادل
دھوپ اور فضا میں پائی جانے والی چیزوں کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ جو شخص ناشکرا اور
جذبۂ شکر سے عاری ہو، وہ گویا اپنے محسن کی طرف سے آنے والی نعمت کو پردۂ خفا میں رکھ
دیتا ہے۔ اسی لئے ناشکری کے لئے بھی کفر کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ خود قرآن مجید میں
بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (مفردات القرآن ۲/۵۵۹)

کسی بھی زبان میں ایک لفظ کا جو حقیقی معنی ہوتا ہے وہ براہ راست اور بالواسطہ
مناسبتوں کی وجہ سے نئے نئے پیکر میں ڈھلتا رہتا ہے۔ ناشکری میں نعمتوں سے جو رد و انکار
کا معنی پایا جاتا تھا، اسی مناسبت سے کافر کا معنی مطلق انکار کرنے والا قرار پایا، اور جو لوگ
اسلامی عقیدہ اور نظام حیات کو نہ مانتے ہوں، ان کے لئے کافر اور ان کی انکاری فکر کے لئے
کفر کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ واعظم الکفر جحود الوحدانیۃ او الشریعۃ
او النبوۃ (مفردات القرآن ۲/۵۵۵)۔ قرآن مجید میں بھی غیر مسلموں کے لئے کافر کا لفظ
اسی معنی میں استعمال ہوا۔ علمائے یہود سے کہا گیا کہ تم اسلام کے اولین منکر نہ بن جاؤ: وَلَا
تَکُونُوْا اَوَّلَ کَافِرٍ بِهٖ (البقرۃ: ۴۱)۔ قرآن نے ایک موقع پر حج کو فرض قرار دیتے ہوئے
کہا ہے کہ جو اس کو نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں۔ فَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ
الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران: ۹۷) مشرکین مکہ آخرت کے جزا و سزا کے منکر تھے، چنانچہ ان کے انکار
آخرت کو قرآن میں اس طرح تعبیر کیا گیا: وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (یوسف: ۳۷)
یہاں کفر کے معنی انکار کرنے اور تسلیم نہ کرنے کے ہی ہیں۔ قرآن نے قیامت کا
نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے کہ اہل دوزخ جب شیطان پر لعنت ملامت کریں گے، تو شیطان

تھا یعنی شیطان صفائی سے کہے گا کہ تم نے جو مجھ کو خدا کا شریک ٹھہرایا تھا میں اس کا انکار کرتا ہوں، اس انکار کو قرآن نے کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِن قَبْلُ (ابراہیم ۲۲) اسی طرح حضرت موسیٰ پر ایمان لانے اور معجزہ کا انکار کرنے والے کے شرک سے منکر ہونے کو لغوی معنی میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے: وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ (الزخرف ۳۰)

دیکھئے یہاں توحید کے انکار کو نہیں بلکہ شرک کے انکار کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، گویا لغت کی رو سے کفر کے معنی، چھپانے، ناشکری کرنے، انکار کرنے اور نہ ماننے کے ہوئے۔

قرآن نے جو اسلام قبول نہ کرنے والوں کو کافر کہا ہے، وہ اسی معنی میں ہے کہ یہ شخص اسلامی تعلیمات کا انکار کرتا ہے، گویا کافر کے معنی غیر مسلم کے ہوئے، جیسے کوئی شخص ہندو نہ ہو تو اس کو غیر ہندو، اور عیسائی نہ ہو تو اس کو غیر عیسائی کہا جاتا ہے، اسی طرح جو شخص اسلام کو نہ مانتا ہو اسے غیر مسلم کہا جائے گا، عربی زبان میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "کافر" کا لفظ ہے، یعنی ایسا شخص جو خدا کو ایک نہ مانتا ہو، اور اسلامی افکار و معتقدات کا قائل نہ ہو، اس میں نہ کوئی خلاف واقعہ بات ہے، نہ کسی کی اہانت ہے، نہ نفرت و عداوت کا اظہار ہے، اگر کسی غیر مسلم کو مسلمان زبردستی مسلمان کہے، جیسا کہ ہمارے ہندو بھائی ان لوگوں کو بھی ہندو کہنے پر مصر ہیں، جو پوری وضاحت و صراحت اور اصرار کے ساتھ اپنے ہندو ہونے کا انکار کرتے ہیں، تو یہ بےشک ان کی توہین کی بات ہوتی، پس حقیقت یہ ہے کہ اگر اس لفظ کے معنی پر غور کیا جائے، تو جن لوگوں کے لئے یہ تعبیر اختیار کی جارہی ہے، ان کے لئے یہ تعبیر محض ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے، نہ کہ یہ دعوت نفرت پر ابھارنے والی تعبیر ہے۔

پھر غور کیجئے کہ قرآن مجید میں زیادہ تر اہل مکہ کو کافر کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے، اگر اس تعبیر میں توہین اور تمسخر مقصود ہوتا تو عرب جو اس زبان کے رمز آشنا اور ذوق ادب کے حامل تھے، وہ اس پر معترض ہوتے، لیکن اہل مکہ کی طرف سے کوئی ایسا احتجاج سامنے

مذہب کی تبدیلی

تمل ناڈو حکومت نے تبدیلی مذہب کے سلسلہ میں جو آرڈیننس جاری کیا ہے، وہ فرقہ پرست عناصر کو خوش کرنے کا ایک حربہ اور ہندوستان کے جمہوری اقدار کا علانیہ قتل ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج میں ایک عرصہ سے مذہب کی تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ ہندو مذہب میں بنیادی طور پر کوئی ایسا متعین عقیدہ نہیں پایا جاتا، جس کو ہندو عقیدہ اور آئیڈیالوجی کا نام دیا جاسکے، جو لوگ رام کو بھگوان اور خدا مانتے ہوں، وہ بھی ہندو ہیں، اور جو لوگ راون کو خدا قرار دیتے ہوں اور رام کو بُرا بھلا کہتے ہوں وہ بھی ہندو مذہب ہی کے علمبردار ہیں۔ اور پیریار وغیرہ جیسے دانشور جو سورج کی پوجا اور دیوی دیوتاؤں کے وجود کو توہم پرستی قرار دیتے ہوں وہ بھی ہندو ہیں، غرض ہندو مذہب موم کی ناک ہے، اس کی جو صورت چاہو بنالو، توہم پرستی ہی کے نتیجے میں طبقاتی تقسیم ہندو عقیدہ کا اٹوٹ جزء ہے، اور اسی لئے ہندوستان میں ہزاروں سال سے دبے کچلے ہوئے لوگوں کا احساس ہے کہ ہندو مذہب دراصل مذہبی قالب میں "برہمن واد" کی حفاظت سے عبارت ہے، اس نظام نے صدیوں سے دلت اور پست طبقات کو اپنے طاقتور پنجے میں دبا رکھا ہے، جب بھی انھوں نے انگڑائی لینے کی کوشش کی، نہایت ذہانت کے ساتھ ان پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی گئی۔

حالانکہ ہمارا موجودہ جمہوری ڈھانچہ ذات پات کے تصور کی نفی کرتا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی برہمنوں کی تعداد تو چار پانچ فیصد سے زیادہ نہیں، حکومت کے کلیدی عہدوں پر ان کی تعداد ۶۳ فیصد ہے، سیاسی تبدیلیوں سے چہرے بدلتے ہیں، لیکن اس حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، آج تک پست اقوام میں کوئی شنکر اچاریہ اور مٹھ کا سربراہ نہیں بن سکا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندو قوم میں یہ مسئلہ محض ایک سماجی

مسئلہ نہیں، بلکہ اس کی جڑیں عقیدہ کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، ان حالات نے دبے کچلے لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہندوازم کے اس قید خانے سے اپنے آپ کو باہر نکالیں، اور باعزت انسان کی طرح سماج میں زندہ رہیں، اس کے لئے مشہور رہنما امبیڈکر نے بودھ ازم کو قبول کیا، لیکن جلد ہی سمجھدار اور باشعور لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ شراب کو آب سمجھنے کے مترادف ہے، بدھسٹ سماج کو ہندو سماج نے اس طرح جذب کر لیا ہے کہ گویا یہ قید خانہ کی ایک کوٹھری سے نکل کر دوسری کوٹھری میں داخل ہونا ہے، وہی سماج، وہی تہذیب، وہی رسوم و رواج، بس خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ، یا کچھ ہوتا اس کی تبدیلی، یہاں تک کہ دستور ہند کے مطابق بھی اس تبدیلی مذہب کے باوجود وہ ہندو ہی شمار کیا جاتا ہے، لوگ یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جن مذاہب کی پیدائش اور نشو ونما ہندوستان کی سرزمین میں ہوئی ہے، برہمنوں نے اپنی ذہانت سے ان کا ایسا "ہندو کرن" کر دیا ہے، کہ اب کسی کے لئے ان مذاہب میں سے کسی کو اختیار کرنے کے باوجود ہندو سماج کے مظالم سے نجات پانا اور انصاف حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اس لئے بے چین اور بے قرار ذہن و فکر رکھنے والوں کے لئے دو ہی راستے رہ گئے ہیں، عیسائیت یا اسلام؟ اس سے کسی حقیقت پسند غیر مسلم کو بھی انکار نہیں کہ اسلام کے عقائد اور اصول جتنے صاف و شفاف، عقل و فطرت سے ہم آہنگ، متوازن اور انسانی ضروریات کے لئے موزوں اور مناسب ہیں، کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی، اللہ کی وحدت اور انسانوں کی وحدت، یہ اسلام کا انقلابی تصور ہے، اور دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اگر خدا ایک ہے، اس کا کوئی خاندان، کنبہ نہیں، اور کسی انسانی طبقہ سے اس کی قرابت مندی اور رشتہ داری نہیں تو اس سے خود بخود انسانی وحدت اور مساوات کا تصور ابھرتا ہے، پھر اسلام میں کوئی عقیدہ "پہیلی" کی طرح نہیں کہ اس کا سمجھنا مشکل اور سمجھانا مشکل تر ہو، جیسا کہ ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں ایک میں تین اور تین میں ایک کا تصور ہے، یا عقیدۂ کفارہ ہے کہ غلطی کوئی کرے اور سزا حضرت مسیح کو جھیلنی پڑے، اسی لئے مسلمان حالانکہ اس ملک میں بہت تھوڑی تعداد میں آئے، لیکن اس ملک

کے باشندوں نے جو طبقاتی تقسیم کی وجہ سے ظلم وجور سے دوچار تھے، اور دیوتاؤں کی ایک فوج کی پرستش کرتے کرتے عاجز آچکے تھے، انہوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا، افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش اور برما تک جو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے وہ اسلام کی اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس ملک میں جبراً تبدیلیٔ مذہب کرایا ہے، لیکن یہ ایسا جھوٹ ہے کہ خود عقلِ عام اس کو جھٹلاتی ہے، ہندوستان کی جنوبی اور ساحلی علاقوں میں تو اسلام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی کے عہد میں آچکا تھا، اور نہ صرف یہ کہ تجار بلکہ بعض راجاؤں نے بھی اسلام قبول کیا تھا، اس وقت یقیناً زور وجبر سے کوئی فوجی تو قطعاً ہندوستان نہیں پہونچا تھا، اس وقت جبر ودباؤ کی کیا گنجائش تھی؟ پھر غور کیجئے کہ مسلمانوں نے اس ملک کے مختلف حصوں پر کم وبیش آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے، آج جب حکومت کے بغیر ہندو سماج میں تبدیلیٔ مذہب کا طوفان اٹھا ہوا ہے، اور کئی ریاستوں میں آبادی کا توازن بدل چکا ہے، تو اگر اتنا طویل عرصہ جبر ودباؤ سے کام لیا جاتا تو کیا یہ ملک مسلم اکثریت نہیں بن گیا ہوتا؟، حقیقت یہ ہے کہ جبر ودباؤ تو الگ چیز ہے، مسلمان حکمرانوں نے تو عام طور پر اسلام کی تبلیغ ودعوت کی طرف بھی توجہ نہیں کی، اور اشاعتِ دین کی طرف سے انتہائی تغافل برتا، ورنہ اگر اس سلسلہ میں تھوڑی بھی کوشش کی جاتی تو اسلام میں جو کشش ہے، وہی لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے کافی ہوتی۔

اسلام کے بعد اس ملک کے لوگوں کے لئے زیادہ قابلِ توجہ مذہب عیسائیت ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے سو سال میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد نے عیسائیت کو قبول کیا ہے، اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کئی ریاستوں میں تو عیسائیت اکثریتی مذہب بن گیا، میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ دو ہے، ایک تو مادی وسائل کا استعمال، ہسپتال، درسگاہیں، اور معاشی فلاح کے مراکز کے قیام وانتظام نے عیسائیت کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ مقامی آبادی میں اثر ونفوذ حاصل کرے اور ان میں داخل ہو سکے، دوسرے گو عیسائیت ایک عالمی مذہب اور ترقی یافتہ قوم کا مذہب ہونے کی وجہ سے ہندو ازم کے ساتھ

مکمل طور پر جذب نہیں کی جا سکتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت کوئی سماجی تحریک نہیں ہے۔ شادی، بیاہ، سماجی رسم و رواج وغیرہ میں وہ ہندو سماج ہی کا ایک حصہ بن سکتے ہیں۔ ان کے پاس حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا کوئی مکمل نظام حیات نہیں، جو ان پر قیود و حدود عائد کرتا ہو اور اپنے پہلے معمولات سے روکتا ہو۔ اکثر اوقات تو نام بھی تبدیل نہیں کئے جاتے، بس کچھ تہواروں کا فرق ہوتا ہے۔ شرک پہلے بھی تھا، اور اب بھی ہے، مورتی کی پرستش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، اس لئے جب کوئی ہندو عیسائی مذہب قبول کرتا ہے تو اسے بہت ہی معمولی تبدیلیوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس کی عملی زندگی میں تو کوئی انقلاب آتا ہی نہیں، اور اسے فکر و عقیدہ کے اعتبار سے بھی کسی غیر معمولی تبدیلی سے گذرنا نہیں پڑتا۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں دورنگی اور دوغلی روا نہیں رکھتا، اسلام قبول کرنے کا مطلب خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ نہیں، بلکہ اللہ سے رشتہ جوڑ کر تمام توہمات سے رشتہ توڑنا ہے، اس کی عبادتیں الگ ہیں، اس کے تہوار الگ ہیں، وہ غیر مسلم خاندانوں سے شادی بیاہ کا تعلق قائم نہیں رکھ سکتا، وہ ایمان لانے کے بعد اپنے والدین کے ترکہ سے حصہ نہیں پا سکتا، اس کو کھانے، پینے، خریدنے، بیچنے، کمانے غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حلال و حرام کی حدیں قائم کرنی پڑتی ہیں، اور حرام سے بچنا پڑتا ہے، اور یہ یقیناً آسان ہے، لیکن جو نفس کی ہر خواہش پر لبیک کہنے کا عادی بن چکا ہو، اس کے لئے حق پر کاربند ہونا لوہا کو چنا چبانے کے مترادف ہے، گویا مسلمان ہونے کے بعد انسان ایک سماج سے دوسرے سماج کی طرف ہجرت کرتا ہے، اس لئے یہ پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ کانٹوں کا فرش ہے، اسی بناء پر جو لوگ خدا سے ڈر کر سچائی اور حقیقت کی تلاش کے جذبے سے مسرور ہو کر اور عزم و ارادہ کی قوت سے مسلح ہو کر قدم اٹھانا چاہیں، وہی اس راہ پر آسکتے ہیں، کسی بھی شخص کو حقیر، معمولی اور مادی مقاصد کے تحت اس راہ میں آبلہ پائی کا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک تو ان مشکلات اور دوسری طرف دعوت اسلام کے کاموں سے غفلت کی بناء پر آزاد ہندوستان میں عیسائیت کی طرف ہندو سماج کا رجحان زیادہ ہوا ہے۔

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، جو ہر شخص کو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل

کرنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے، چنانچہ دستورِ ہند کے بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ میں تمام شہریوں کے لئے آزادیِ ضمیر اور آزادی سے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق شامل ہے، اس لئے سنگھ پریوار کا "دھرم پری ورتن" پر چیخ پکار کرنا یقیناً ہندوستان کے دستور سے بغاوت کرنے کا مترادف ہے، اپنی بیماری کو دور کرنے کے بجائے ان لوگوں کو برا کہنا جو بیماری کو بیماری سمجھتے ہیں، بے وقوفی ہی کہی جاسکتی ہے۔

اسلام نے بھی ضمیر و اعتقاد کی آزادی کو تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا کہ ہدایت و گمراہی کے متعلق دلائل واضح ہو چکے ہیں، لہٰذا دین کے معاملہ میں کوئی جبر و دباؤ نہیں ہے "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرۃ: ۲۵۶) رسول اللہ ﷺ سے صاف ارشاد فرمایا گیا کہ آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے، آپ داروغہ نہیں ہیں کہ ان کو اپنی بات ماننے پر مجبور کردیں "إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ" (الغاشیۃ: ۲۱-۲۲) ایک موقع پر ارشاد ہوا کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسان ہی مومن ہو جاتے، پھر کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کردیں گے؟ "أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ" (یونس: ۹۹) پیغمبر اسلام ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں، آپ پر تو بس یہ ہے کہ پیغامِ حق کو صاف صاف اور کھلے طور پر پہنچا دیں، اور بس "فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ" (النحل: ۸۲) آپ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ کفر پر مصر ہیں، ان سے کہہ دو کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے، اور میرے لئے میرا دین "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" (الکافرون: ۶) ایک اور موقع پر آپ کی زبان سے کہلایا گیا کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال "لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ" (الشوریٰ: ۱۵)۔

غرض عقیدہ و ضمیر کی آزادی کا قائل اسلام بھی ہے، وہ کسی شخص کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرتا، ہاں جہاں اسلامی حکومت ہو اور ایک شخص نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے شہریت قبول کی ہو اور حقوق حاصل کئے ہیں، اس کا اسلام سے کفر کی طرف سفر کرنا نہ صرف روشنی سے تاریکی کی طرف سفر کرنا ہے، بلکہ گویا ملک سے بغاوت ہے، اور بغاوت کسی بھی سیاسی نظام

اسلام اور غیر مسلم

اسلام "سلم" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح وسلامتی کے ہیں، اور ایمان "امن" سے ہے جو ظاہر ہے کہ امن وآشتی کو بتلاتا ہے، گویا صلح وسلامتی اور امن وآشتی اس دین کی خمیر میں داخل ہے، اسلام کی تمام تعلیمات اس کے اسی مزاج و مذاق کی آئینہ دار ہیں، اس نے محبت کا سبق سکھایا ہے، اللہ سے محبت، اللہ کے رسول سے محبت، مسلمانوں سے محبت، پوری انسانیت سے محبت اور تمام مخلوقات سے محبت، غرض یہ دین، دین محبت ہے، نہ کہ دین نفرت، یہ مذہب اخوت کا مذہب ہے نہ کہ عداوت کا، یہ صلح کی دعوت ہے نہ کہ جنگ کی، اس نے اس وقت محبت کی شمع جلائی جب ہر طرف بغض و عناد کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

مگر افسوس کہ جو لوگ صدیوں سے نفرت کے سوداگر ہیں، جو شب و روز انسانیت کو ہلاک و برباد کرنے والے ہتھیاروں کی تیاری میں مصروف کار ہیں، اور جو پوری دنیا میں انسانوں کی تباہی و بربادی کے اسباب کی تجارت کر رہے ہیں، اور یہی ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اور دنیا پر ان کے رعب و دبدبہ کا سبب و وسیلہ ہے، وہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے پروپیگنڈے کر رہے ہیں، اور یہ پروپیگنڈہ اس شد و مد اور قوت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ مشرق و مغرب گویا اس پر ایمان لا چکا ہے، یہاں تک کہ خود بعض مسلمان بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔

جب بھی کوئی ایسا موقع آتا ہے، جس میں پروپیگنڈے کی اس آنچ کو تیز کرنے کا موقع ہو، تو ہمارا میڈیا ہرگز اسے ضائع ہونے نہیں دیتا، بلکہ نمک مرچ لگا کر اس میں اضافہ ہی کرتا ہے ... اس کی ایک مثال "طالبان" سے متعلق حالیہ خبریں ہیں، پہلے یہ

خبر آئی کہ طالبان ہندو اقلیت کو افغانستان سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں، پھر یہ ہوا کہ انھوں نے ہندو اقلیت پر زرد کپڑے پہننے کا لزوم کر دیا ہے، پھر یہ خبر آئی کہ ان کے لئے زرد شناختی کارڈ بنائے گئے ہیں، ان خبروں کو ہمارے ذرائع ابلاغ نے بلا تحقیق بلکہ طالبان کی وضاحت کے باوجود بہ اصرار و تکرار اتنا پھیلایا کہ اس سے اکثریتی فرقہ میں بجا طور پر اشتعال کی کیفیت پیدا ہوئی، مسلمانوں کے تئیں نفرت میں اضافہ ہوا، ظاہر ہے کہ یہ ایک منصوبہ بند سازش ہے، اور اس کا مقصد پوری دنیا میں مسلمانوں کے وقار کو مجروح کرنا اور ہندوستان میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے تئیں مخالفانہ جذبات کو ہوا دینا ہے۔ طالبان کی طرف سے یہ وضاحت آچکی ہے کہ انھوں نے اقلیت پر کسی خاص لباس کا لزوم نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے لئے محض شناختی کارڈ زرد رنگ کا جاری کیا گیا ہے، اور وہ بھی اس لئے کہ افغانستان میں مسلمانوں پر نماز باجماعت قانونی طور پر لازم قرار دی گئی ہے، غلط فہمی میں بعض دفعہ افغان پولیس غیر مسلموں کو بھی مسجد جانے کا پابند بناتی تھی، اس پر وہاں کے غیر مسلموں نے حکومت سے خواہش کی کہ ان کے لئے کوئی ایسی شناخت فراہم کی جائے کہ پولیس والے انھیں تنگ نہ کر سکیں، اسی پس منظر میں ان کے لئے زرد شناختی کارڈ جاری کیا گیا ہے، تاکہ پولیس کو پہچاننے میں سہولت ہو، اور غیر مسلم بھائیوں کو کوئی دشواری نہ ہو۔

غور کیجئے کہ طالبان کے اس عمل میں اقلیت کی ایذا رسانی اور ضرر رسانی کا جذبہ کارفرما ہے یا ان کی سہولت و آسانی کا؟ مختلف مصلحتوں کے تحت یہ بات مروج ہے کہ مخصوص کارڈ جاری کئے جاتے ہیں، بعض مغربی ملکوں میں شہریت کے کئی درجات ہوتے ہیں، اور ہر درجے کے لئے الگ الگ رنگوں کے کارڈ بطور شناخت ہوتے ہیں، اس میں تذلیل و تحقیر مقصود نہیں ہوتی، اگر طالبان نے بھی غیر مسلم بھائیوں کی سہولت اور اپنی قانونی مصلحت کے پیش نظر کوئی شناختی کارڈ جاری کیا ہو، تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسے کیوں کر ناانصافی کہا جا سکتا ہے؟

اس موقع پر اس امر کی وضاحت مناسب ہوگی کہ غیر مسلموں کے بارے میں

اسلام کا رویہ کیا ہے؟ ـــــ انسانی عزت و تکریم اسلام کی بنیادی فکر میں داخل ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ اسلام میں اسی کو عقیدہ کا درجہ حاصل ہے تو بے جا نہ ہوگا، قرآن نے کہا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ کہ اللہ نے بنی آدم کو کرامت و شرف کا تاج پہنایا ہے، قرآن نے انسان کے جسمانی قالب کو سب سے بہترین سانچہ قرار دیا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت آدم فرشتوں جیسی عظیم مخلوق کے بھی مسجود تھے، اور قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ تمام انسان حضرت آدم ہی سے پیدا ہوئے ہیں: خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ یہ انسانی کرامت کا پہلو ہی اسلام کو تمام انسانوں کے احترام کا تصور عطا کرتا ہے، اس لئے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ بھی تحقیر و اہانت کا سلوک روا نہیں۔

اس بات کو آپ ﷺ نے اپنی مختلف تعلیمات کے ذریعہ واضح فرمایا، آپ ﷺ نے جنگ کے دوران نعش کا مثلہ کرنے سے منع فرمادیا، غزوۂ خندق کے موقع سے جب ایک مشرک حملہ آور ہوا اور مارا گیا تو مشرکین مکہ نے لاش کی قیمت ادا کرنی چاہی، لیکن آپ ﷺ نے نفرت و انتقام کی آگ کے عین شباب کے وقت بھی اس کو گوارا نہیں فرمایا کہ انسانی جسم کی قیمت وصول کی جائے، ایک یہودی کا جنازہ گذر رہا تھا آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، صحابہ نے عرض کیا: یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہے، آپ نے غیر مسلم بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو خطوط لکھے تو ان کے احترام کا پورا پاس و لحاظ رکھا، بعض مشرکین آپ ﷺ کے یہاں مہمان ہوئے تو آپ ﷺ نے پورا اکرام فرمایا اور مہمان نوازی کا حق ادا کیا، غرض کہ انسانی تکریم اور احترام کے اعتبار سے آپ ﷺ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فرق نہیں کیا۔

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی، ماں باپ، بال بچوں، بھائی بہنوں، بیوی اور دوسرے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور سفر کے ساتھیوں، ماتحتوں اور کمزوروں، بیماروں اور مسافروں وغیرہ کے ساتھ حسن سلوک کے جو بھی احکام دیئے گئے، ان کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا گیا، بلکہ اسی سلوک کا حکم تمام انسانوں کے لئے

سے بڑھ کر رواداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ مذہبی عبادت گاہوں کے احترام کا بھی اسلام نے پورا لحاظ رکھا ہے، شام اور بیت المقدس کا علاقہ جب فتح ہوا تو وہاں کتنے ہی چرچ تھے، جن کو مسلمانوں نے جوں کا توں باقی رکھا۔ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے گورنروں کو ہدایت فرمائی تھی کہ کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، اسی طرح غیر مسلم بھائیوں کے جذبات بھی ملحوظ رکھنے کا حکم دیا تھا، اور وہ جن معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہوں، ان کو بھی برا بھلا کہنے کی ممانعت کی گئی۔ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ (......)

معاشرتی اور تمدنی قوانین میں بھی غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی، وہ جس چیز کے کھانے کو حلال سمجھتے ہوں، گو اسلام میں اس کا کھانا حرام ہو، لیکن ان کو اپنے مذہب کے مطابق کھانے پینے کی اجازت ہے۔ اس لئے غیر مسلموں کو شراب پینے اور آپس میں شراب وخنزیر کی تجارت کرنے کا حق حاصل ہوگا، جن خواتین کو قرآن نے محرم قرار دیا ہے، اور ان سے کسی قیمت پر نکاح کو روا نہیں رکھا ہے، اگر ان کے مذہب میں ان خواتین سے نکاح کی اجازت ہو تو انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہوگا، یہی حال دوسرے سماجی وتہذیبی قوانین کا ہے۔

اگر مسلم ممالک میں کسی غیر مسلم کو اپنے روایتی لباس اور پوشاک میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مقصد ان کی تحقیر نہیں، بلکہ ان کی تہذیب کی حفاظت اور ان کے تشخص کو برقرار رکھنا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے تمدن کو قائم رکھے، اسی لئے مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کی وضع اختیار کرنے اور ان کی تہذیب میں جذب ہونے سے منع فرمایا گیا تو اگر تاریخ میں کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہوں تو اس میں ان کی تحقیر واہانت نہیں بلکہ ان کا تحفظ اور ان کی تہذیب کے بقا کا سروسامان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نہ صرف عقیدہ وایمان بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اپنا تشخص چاہتا ہے، اور یہ بات کہ مسلمان اپنے وجود کو گم کردیں، اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ دوسری قوموں کے تئیں حسن سلوک، رواداری، بقاء باہم کے

اصول پر ایک دوسرے کے بارے میں تحمل، عبادات اور سماجی قوانین میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور عدل کا داعی ہے۔ وہ دین محبت اور دین اخوت ہے اور اس نے پوری کائنات سے محبت کا درس دیا ہے۔ وہ انسان کو بحیثیت انسان قابل تکریم سمجھتا ہے اور تمام مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے۔ رحم دلی اور عدل سے زیادہ اسے کوئی چیز محبوب نہیں اور ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز اسے ناپسند نہیں۔

(۲۹؍جون ۲۰۰۱)

غیر مسلموں سے تعلقات

موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور افسوس ہے کہ ہم اس مسئلہ پر محض سیاسی اور مادّی نقطۂ نظر سے غور کرتے رہے ہیں، حالانکہ جب ہم اسلام کو ایک ہمہ گیر اور جامع نظامِ حیات سمجھتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی اسلامی نقطۂ نظر سے سوچیں اور دیکھیں کہ اس بارے میں حقیقی اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

پوری انسانیت ـــــ ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اسی جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی:

"یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ" (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے، پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت کو وجود بخشا۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے، یا ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستے کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اخوت کا سبق ملتا ہے، جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان، انسانی رشتے سے

ہمارا بھائی اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ تصور ہم میں پوری برادری سے محبت و پیار کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہمیں ہر فرد بشر سے محبت ہونی چاہیے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت و کرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیت انسان اللہ تعالیٰ نے قابلِ احترام قرار دیا ہے۔

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (بنی اسرائیل۔۷۰)

اس کے جسمانی سانچے کو بہترین سانچہ قرار دیا ہے۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ" (التین۔۳)

"ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔"

یہ تکریم و احترام تمام نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جارہا تھا۔ آپ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے۔ (بخاری حدیث نمبر ۱۳۱۲، باب من قام لجنازة یہودی) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہلِ مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالے کر دیں، تو آپؐ نے کوئی قیمت لیے بغیر نعش واپس کر دی، کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء بریدہ کر دیتے اور اپنی آتشِ انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا، لیکن اگر اس کی نوبت آہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کیے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جلا کر مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے جائیں، کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

اسلام بحیثیت انسان کسی غیر مسلم کی توہین و تحقیر کو بھی روا نہیں رکھتا۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لیے "کافر" اور "ذمی" کا لفظ استعمال کر کے ان کی تحقیر کی گئی ہے۔ اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی "کافر" کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے۔ "کفر" کے معنی انکار کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: "وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ" (یوسف: ۳۷) اہل مکہ ان باتوں سے انکار کرتا جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیا کرتے تھے، اس لیے وہ کہتے تھے: "إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ" (الزخرف: ۲۴) یعنی "آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔" اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل کیا ہے: "قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ" (الزخرف: ۳۰)

پس "کافر" کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم 'Non Muslim' کا ہم معنی لفظ ہے۔ پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو "کافر" کے لفظ سے مخاطب کیا گیا، لیکن انہوں نے اس کا برا نہیں مانا۔ اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقیناً انہوں نے اس طرز تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا۔ پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو "اے کافر" کہنے سے اذیت ہوتی ہو تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا تو گنہگار ہوگا:

ولو قال لذمي يا كافر، يأثم إن شق عليه. (الأشباه والنظائر

۲/۲۵۷)

اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں گذرتا ہو تو اسے کافر کہنے والا شخص گناہگار ہوگا۔

ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمت'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں۔ ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے:

''رجل ذمی، معناہ له عهد.'' (لسان العرب ۵/۵۹)

مرد ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لیے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں:

سمی أهل الذمة لدخولهم في عهد المسلمين و أمانهم.

(النہایۃ ۲/۱۶۸)

''اہل ذمہ اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

اس لیے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیث نبوی میں غیر مسلموں کے لیے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن و حدیث نے ہمیں تفصیلی رہنمائی دی ہے:

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلے میں بنیادی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

الْمُقْسِطِيْنَ. (الممتحنہ: ۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انہوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انہیں بہرحال اس کا اجر ملے گا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ. (بقرۃ: ۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لیے اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کرو گے تم کو پورا پورا دیا جائے گا، (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لیے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، (تفسیر قرطبی ۳/۳۳۷) اللہ تعالیٰ نے ان کے

اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہیے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہوگئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور ٹکراؤ، گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لیے پانچ سو دینار بھیجے! حالانکہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ نے یہ رقم سرداران قریش ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کر رہے تھے۔ (رد المحتار: ۳/ ۳۰۲، باب المصرف)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ مجھے جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا: ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے، ”ما انصفناك أكلنا شبيبتك ثم نأخذ منك الجزية“ (نصب الرایہ: ۲/ ۳۹۵) چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جا سکتے ہیں۔ (دیکھئے الدر المختار مع الحاشیہ رد المحتار: ۳/ ۳۰۱)

انسانی زندگی کا احترام و تحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان و مال اور عزت و آبرو سے ہے، چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو دی گئی ہے؛ اسی سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں۔

وَدِمَاؤُهُمْ كَدِمَائِنَا، وَأَمْوَالُهُمْ كَأَمْوَالِنَا. (نصب الرایہ ۳/ ۳۶۹)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ. (بنی اسرائیل: ۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا. (مائدہ: ۳۲)

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کرسکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل وغارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے، اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے، بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم — جس سے امن اور بقاء باہم کا معاہدہ ہو — کے قاتل کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا:

مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا يُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا. (بخاری عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر ۳۱۶۶)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پر امن زندگی گزارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلے سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کردے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کردیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے

شخص کا قاتل ہو وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: "النفس بالنفس" (المائدہ: ۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا۔ (مصنف عبدالرزاق ۱۰۱/۱۰) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے "ذمی" کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا۔ (مصنف عبدالرزاق ۱۰۱/۱۰) امام شافعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔

(مسند امام شافعی، السنن الکبریٰ ۳۴/۸)

اگر مقتول کے ورثاء سزا بخش کر معاف کر دیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد و ارادہ کو دخل نہ ہو بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلے خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے، چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی۔ (سنن دارقطنی، کتاب الحدود) حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعی نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔

(دیکھئے نصب الرایہ ج ۴/ ۳۶۶-۳۶۹) (جاری)

املاک کا احترام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کی جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جا سکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا "الا ان تکون

تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" (النساء: ۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کر دیئے اور کچھ پھل کھا لیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔ (ابو داؤد، حدیث نمبر ۳۰۵۰)

متعدد صحابہؓ سے آپ کا یہ ارشاد منقول ہے:

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوِ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

(ابو داؤد، حدیث نمبر ۳۰۵۲)

آگاہ ہو جاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے۔ (المغنی لابن قدامہ: ۱۲/۴۵۱، بہ تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تفریق مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے، امتوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں غیر مسلموں سے متعلق جو احکام ملتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

☆ مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے سوائے ذبیحہ کے۔

☆ مسلمان اور غیر مسلم رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ غیر مسلم قریب کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی۔ حربی سے مراد وہ شخص ہے جو دشمن ملک کا ہو۔

☆ مسلمانوں کے لیے عیسائی پادری سے مصافحہ کرنا درست ہے۔

☆ یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆ جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز کو تعزیت کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے جائیں:

أخلف الله خيرًا منه و أصلحك (ہندیہ ۵/۳۴۸)

اللہ تم کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

تعلیم و تعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم و تعلم بھی درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "علم و حکمت مومن کی متاعِ گم شدہ ہے۔" "الحکمۃ ضالۃ المؤمن" (ترمذی عن ابی ہریرہ، حدیث نمبر ۲۶۸۷) چنانچہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپ نے ان کا فدیہ بھی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اسی لیے تعلیم و تعلم کے متعلق رشتہ میں مذہب کی تمیز و کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسوم و رواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو ملحوظ رکھیں، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ:

"لیس منا من تشبہ بغیرنا" (جامع ترمذی، حدیث نمبر ۲۶۹۵)

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لیے آپ نے سلام کے طریقے، داڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں ان سے بہت توجہ سے تفریق کیا ہے کہ مسلمان اپنے تمیز کو کھو دیں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو جہل اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے۔ اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کر لیا، جس کا بخاری اور مختلف کتب احادیث میں ذکر موجود ہے۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۳۲۸، باب معاملۃ النبی علی اهل خیبر) مسلمانوں کے لیے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں؛ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتب احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔ (کنز العمال، ۳۲۸۱۲) حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائل کے لیے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے: "خباب كان قينا فعمل للعاص بن وائل" (بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۷۵، مسلم، حدیث نمبر: ۲۷۹۵)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظم نہیں تھا، اور پورا عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اس لیے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی، اور عام لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو "دلیل" کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لیے بطور "دلیل" اجرت دے کر ساتھ رکھا، (احکام اہل الذمہ لابن قیم: ۲۰۷) اسی لیے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم

رکھ سکتے ہیں: یجوز ان یکون الاجیر ذمیا و المستاجر مسلما بلا خوف

(الموسوعۃ الفقہیہ: ۱/۲۰۵، ۱ اجارہ)

چنانچہ مسلم عہد حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حمص کا فینانشل کمشنر اور حاکم ابن اثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامین سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت و ملم کے تاجدار عضد الدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا صرف اپنی طاقت و حکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے مقالات شبلی: ۱/۲۱۰-۲۰۹)

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا، کیوں کہ سیاسی مدوجزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک جان کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے، چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی منضبط حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانے میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے ایک یمانی شخص کا

اس فریضہ کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک و سہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی بر انصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو صورتوں پر مبنی ہوں گے، اول ان قوانین کی اطاعت پر، جو مبنی بر انصاف ہوں کیونکہ آپ جس ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو گویا زبان حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور وفاداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد، جو ہم نے ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (المائدۃ ۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: "اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ" (الاسراء ۳۴) نجی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، تو قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا، بشرطیکہ وہ صریح عدل کے خلاف نہ ہوں۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سد باب میں باہمی تعاون ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر منکر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، "منکر" میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منکر کو روکنے کے طریقے کے سلسلے میں یہ اصول بتایا کہ اس کے لیے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کر سکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کر سکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا جانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ.

(مسلم، حدیث نمبر ۴۹)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

"ید" ایک عام معنی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں دستوری اور پرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے، اسی لیے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے، لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ. (النساء: ۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض دوطریقے بھی منقول ہیں۔

(مجمع الزوائد ۸/۱۷۰، باب ماجاء فی اذی الجار)

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے، البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں حصہ داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم و جور کی سرکوبی مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام، ان دونوں نکات کی کسی قدر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں، زندگی کے چار شعبوں میں ان کے لیے قانون شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوال شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب و ضمیر سے ہو، جیسے توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

"عبادات" سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

"احوال شخصیہ" سے مراد Parasnal Law ہے، اس میں نکاح، طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق و فرائض بھی آجاتے ہیں۔

"معاملات" سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات و معاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اسی شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود و قمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک، اور کلید اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لیے ان قوانین میں شریعت اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم و سزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظام مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کیے جا سکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

اپنی شناخت کی حفاظت

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے ساتھ ضم نہ کرلیں۔ بلکہ اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارَىٰ الخ

(اخرجہ الترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستئذان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

پس تشبہ اور مماثلت کے چار مدارج ہو سکتے ہیں:

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں۔ فقہاء نے اسے باعث کفر قرار دیا ہے، مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس پر کفر کا حکم لگایا ہے: وَلَوْ وَضَعَ عَلٰى رَأْسِهٖ قَلَنْسُوَةَ الْمَجُوْسِ كَفَرَ۔

(المحیط فی الفتاوی الخیریہ: ۲۴۵)

اسی طرح فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے، کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت: یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے ملک کے مطابق رواداری ہو، تو حرام ہے اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضامندی کا اظہار اور تائید و تحسین مقصود ہو تو کفر ہے "إِنَّمَا الرِّضَا بِالْكُفْرِ مُسْتَحْسِنًا كُفْرٌ" (المحیط ۲۴۵) کیوں کہ آدمی جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو درست خیال کرتا ہو اس میں شرکت اور اس پر رضامندی و خوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دو رنگی اور نفاق کی بات ہے۔ اس لیے اسلام نے مسلمانوں کے لیے اس بات کو پسند کیا ہے

اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد تہذیبی ہم رنگی کو برقرار رکھنا سمجھا گیا ہے، وہ دوسری قوموں سے بھی اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ مسلمانوں کی وضع قطع کو اختیار کر لیں۔

اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا عام ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی ثقافت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں، اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے بارے میں تنگ نظری ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی اقتدار قائم ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی و تہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گزاریں۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی امور میں عدم مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب و محبوب نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے، اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر و تشدد جائز نہیں:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (البقرۃ: ۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۔ (یونس: ۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کریں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کر لے، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو تمھیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتے رہے، حضرت عمرؓ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" یہاں تک کہ وفات کے قریب آپؓ نے ان کو آزاد کر دیا۔ (کتاب الاموال ص ۱۵۳)

مذہب پر عمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (الکافرون: ۶) "تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین" ایک اور موقع پر ارشاد ہے: "لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ" (الشوریٰ: ۱۵) "ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کر کے مسجد نبویؐ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (احکام اہل الذمہ ۱/۳۱۹) فقہاء نے لکھا ہے کہ:

> اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔
>
> (احکام اہل الذمہ ۱/۳۱۹)
>
> اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اسے روک نہیں سکتا۔
>
> (حوالہ سابق)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے، حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے، لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ (انعام: ۱۰۸)

وہ خدا کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج: ۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں خواہ کسی مذہب کی ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور مذہبی امور میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لیے انہوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے گرجے اور کنیسے منہدم نہیں کیے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (کتاب الخراج ۱۴۳)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، وسیع الظرف اور روادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں۔

جہاد ۔۔۔ حقیقت اور غلط فہمی

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک و شبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے جہاد، جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہ تیغ کر دیتا ہے، اسی لیے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی عمل۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۔ (البقرہ: ١٩٠)

اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں "حد سے تجاوز کرنے" کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اول یہ کہ جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ٢٦١٤)

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے، کہا ہے:

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۔ (محمد: ١)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کے ظلم و زیادتی اور جبر و استبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس

مضمون کو ایک سے زیادہ موقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (النساء ۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، یعنی تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال ۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے۔ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور دوسرے کسی مسلمان گروہ کے اگرچہ آزاد ہوں، تو سیاسی طور پر اور پرامن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جانے کی اور سیاسی و اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا، لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت بہت ہی قابل توجہ ہے۔

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (انفال ۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلبگار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے، لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے

ہوں۔ جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو قبیلے غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ بالکل انصاف کے عمومی اصول اور تقاضے کے مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ توڑا جائے اور انہیں ظلم سے باز رکھا جائے۔ جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انہیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کے بجائے حسن سلوک اور صلح و آشتی کا حکم دیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنہ: ۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

حیاتِ نبوی ﷺ اور جہاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان مدافعتی تھے۔ ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸ افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہا بھارت کی "مقدس جنگ" میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی ماخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی، جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری اور خون

پیچھے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کرے اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے، تو ہم شکر گزار رہیں گے، یہ اس جزیہ کی حقیقت ہے، جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم و زیادتی، تشدد اور جارحیت کا عنوان دیا گیا ہے۔

پس چہ باید کرد؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی سیر چشمی، فراخ قلبی اور رواداری سے آگاہ کریں اور خود اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور تنگ نظر مذہب نہیں ہے؛ بلکہ انسانیت پرور، وسعت نواز، نرم دل، محبت و چاہت والا اور سیر چشم و فراخ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے مسکن رحمت ہے۔ إن الدین عند اللہ الإسلام۔ اللّٰھم أرنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعہ، و أرنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابہ۔
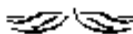
فاصلے کیوں کر گھٹیں گے؟

حالیہ عالمی واقعات کے پس منظر میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو قریب کرنے کی بعض کوششوں کا آغاز ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں وزیر اعظم برطانیہ اور بعض دیگر عالمی قائدین کے بیانات آئے ہیں، نیز ڈائیلاگ بھی منعقد ہوئے، خدا کرے کہ یہ کوششیں اخلاص اور مفاہمت کے جذبہ پر مبنی ہوں، اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں عالمی سطح پر پھیلائی گئی ہیں، یہ ان کے دور ہونے کا سبب بنیں۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا قائل نہیں ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر روا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ ہدایت و گمراہی کو پوری طرح واضح کر دیا ہے: لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی ( ) اگر پیغمبر اسلام ﷺ کا منشا اسلام کو تھوپنا ہوتا تو مدینہ میں کوئی یہودی باقی ہوتا، اور نہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں کوئی مشرک، اسلام کی آمد سے پہلے یہ رواج تھا کہ سلطنت کا جو مذہب ہوتا تمام لوگ اسی مذہب کو قبول کرتے اور اسی پر عمل کرنے کے پابند ہوتے، اسی لئے روم میں کوئی مشرک اقلیت تھی، نہ ایران میں اہل کتاب کا کوئی گروہ تھا، مگر یمن، عرب میں جب پیغمبر اسلام کے ذریعہ دین ابراہیمی کی تجدید ہوئی تو اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ پیغمبر کے سوا کوئی اور شخص اس طوفان کے مقابلہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ یہودیوں کی اس وقت اپنی کوئی مملکت نہیں تھی، اسی لئے وہ بکھرے ہوئے تھے اور نہایت ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو مدینہ اور اس کے جوار میں آباد ہو گئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ کسی بادشاہ یا حکومت کی عملداری میں شامل نہیں تھا۔

مذہب کے معاملہ اسلام کی وسیع النظری کی وجہ سے یہ فکر عام ہوئی کہ لوگوں کو کسی

خاص مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسلام نے باضابطہ مسلم اقلیت کے قوانین وضع کیے، ان کے حقوق و واجبات کو قانونی شکل دی، اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے سدِّ باب کی تدبیریں کیں۔ اس سے مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان بقائے باہم کے اصول پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی راہ ہموار ہوئی۔ مدینہ تشریف لاتے ہی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان آپ نے جو عہد نامہ مرتب فرمایا وہ اسی اصول پر مبنی تھا جس میں بہت صاف طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ تمام باشندوں کو اپنے اپنے دین پر قائم رہنے کا حق حاصل ہوگا، اور اگر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف سے مدافعت کریں گے۔ جب تک یہودیوں کی طرف سے بار بار اس عہد کی خلاف ورزی نہ ہوئی اور انہوں نے اہل مکہ کی طرف سے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی سازش میں شرکت نہیں کی، مسلمان اپنے عہد پر قائم رہے۔

اسلام میں اہل ذمہ سے متعلق جو قوانین ہیں وہ سب اسی بقائے باہم کے اصول پر مبنی ہیں، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مسلمان ان افکار و خیالات کو قبول کر لیں جس سے ان کے ایمان و عقیدہ پر حرف آئے، لیکن اسلامی تعلیم یہ ہے کہ غیر مسلموں کو حق و ہدایت کی طرف بلانے کی کوشش کریں، اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان کے عقیدہ و عمل کے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دیں، اور دنیا میں انسانی رشتۂ اخوت کے تحت ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھیں۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ اسے برت کر دکھایا ہے۔ جب یہود پوری دنیا میں ذلیل و رسوا تھے، اور جگہ جگہ سے شہر بدر کیے جا رہے تھے، اس وقت عالم اسلام ہی میں ان کو پناہ ملتی تھی۔ صلیبی جنگوں میں عیسائی دنیا کی اپنے مسلمان مفتوحین کے ساتھ انتہائی سوز زیادتیوں کے باوجود مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں عیسائی رعایا کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کیا، اور ان کے سلاطین کا سلوک ہمیشہ اس مسلم رعایا کے ساتھ برابری کا رہا۔ اگر پوری دنیا میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ تمام اہل مذاہب کو اپنے اپنے مذہب اور طور طریقہ پر عمل کرنے کی آزادی ہے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو اپنے آپ پر نافذ کرنے کا حق ہے تو تہذیبی تصادم کی نوبت نہ آئے۔ اگر مذہب یا تہذیب کے حامل

انفرادی چاہت ہو وہ صرف ان پر مسلط کرنا چاہیں اور اس بات سے ناراض ہوں کہ ان کی فکر ہر قوم اور ہر خطے میں حکمران الوقت بن جائے تو یقیناً اس سے مختلف تہذیب اور ثقافت ہوں میں تصادم کی صورت پیدا ہوگی۔ اس وقت صورت حال یہی ہے، الجزائر اور ترکی میں جمہوری طریقے پر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس لئے حق نمائندگی سے محروم کر دیا گیا کہ وہ مغربی ثقافت کے مقابل اسلامی ثقافت کے علمبردار تھے، اسی اصول پر سوڈان اور یمن کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، اور دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں مسلمان اور مسلم مملکت میں ظلم و زیادتی کا ہدف بن رہی ہیں۔

بقائے باہم کے اصول کا تقاضا ہے کہ تمام انسانیت کے خون کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ایک ہی قیمت لگائی جائے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم ذمیوں کے بارے میں فرمایا: ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے: دمائهم کدمائنا واموالهم کاموالنا۔ لیکن آج جو لوگ انسانیت کے علمبردار ہیں، کیا وہ پوری انسانیت کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا امریکیوں اور فلسطینیوں کے خون میں فرق نہیں کیا جاتا؟ کیا مشرقی تیمور کے عیسائیوں اور بوسنیا کے مسلمانوں کے تحفظ میں برابر دلچسپی لی جاتی؟ اور کیا افغانستان میں بے قصور لوگوں کے خون سے ہولی نہیں کھیلی گئی؟ اور ستم کا طوفان نہیں بپا کیا گیا؟ کیا آج مغرب میں کالوں کو دوسرے درجہ کا شہری قرار نہیں دیا گیا ہے؟ — یہ کیسی انسانیت ہے جو خون اور خون میں فرق کرتی ہو، یہ کیسی تہذیب ہے جس کے پاس چمڑے کا رنگ انسان کی قیمت مقرر کرنے کا پیمانہ ہے، یہ کیسی جمہوریت ہے جو اسرائیل کو فوج کے ذریعہ بے گناہوں کا گھر زمین بوس کرنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے ان پر روا رکھے جانے والے مظالم کے مقابلہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

دنیا کی مختلف قوموں میں فاصلے دور کرنے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لئے دوسری طرح کی تدبیر "گلوبلزم" کی تلاش ہے، "گلوبلزم" کیا ہے؟ مختلف قوموں کی مشترک تعلیمات اور متفق علیہ نظریات پر ان کو جمع کرنا، تہذیب کی بہت سی

باتیں وہ ہیں جو قدرِ مشترک ہیں، کیوں کہ تمام مذاہب کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، مختلف قوموں میں اللہ کی طرف سے انبیاء اور رسل آتے رہے ہیں، یہ سلسلۂ سعادت پیغمبر اسلام جناب رسول اللہ ﷺ تک پایۂ تکمیل کو پہونچا، آپ کی تعلیمات من جانب اللہ محفوظ ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، آپ سے پہلے جو کتابیں اتریں، ان کتابوں کے حاملین نے ان میں تحریف و تبدیلی پیدا کردی، اور اب وہ اپنے صحیح طریقہ پر دنیا میں موجود نہیں ہیں، لیکن چوں کہ ان سب کا اصل سرچشمہ ایک ہی ہے، اس لئے بہت سی صداقتیں پچھلی کتابوں میں بھی موجود ہیں اور ان سچائیوں پر تمام ہی مذاہب کے حاملین یقین رکھتے ہیں، خدا کا تصور، اچھے اور برے عمل کا تصور، جزاء و سزا کا عقیدہ، انسانیت سے محبت کی تعلیم، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کے احترام کی تلقین، اور اخلاقی بھلائیوں اور برائیوں کا تصور، یہ تمام مذاہب کے درمیان مشترک ہیں، کون مذہب ہے جو ظلم و جور اور ناانصافی کو روا رکھتا ہو؟ کون سا دین ہے جس نے جھوٹ و تکبر کو سراہا ہو؟ کون مذہبی پیشوا ہے جس نے قتل و خون، دوسروں کی عزت ریزی اور لوٹ مار سے منع نہ کیا ہو؟ اگر اقوامِ عالم ان مشترک تعلیمات کو لے کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں، اور اپنی مذہبی تعلیمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسانی محبت کی وہ تصویر پیش کریں جس کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ کرۂ فساد، گہوارۂ امن نہ بن جائے، اور محبت کی شبنم نفرت کے آتش انگاروں کو سرد نہ کردے!

قرآن مجید نے اسی کلمۂ سواء کی طرف انسانیت کو دعوت دی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ (آل عمران ۶۴)

آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب! تم ہمارے اور اپنے درمیان مشترک بات کی طرف آجاؤ۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے کس طبقہ میں اس دعوت کو قبول کرنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت ہے، اور کس طبقہ میں نہیں؟ چنانچہ

فرمایا گیا۔

لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا و لتجدن اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا انا نصارى، ذلك بان منهم قسيسين و رهبانا و انهم لايستكبرون (المائدۃ:۸۲)

آپ اہلِ ایمان کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکین کو پائیں گے، اور محبت میں مسلمانوں سے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور درویش ہیں، اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ قومی نفسیات کے اعتبار سے بہ مقابلہ یہود و مشرکین کے عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ قربت ہے، چنانچہ آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف جو ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں، گو ان میں عیسائی اقوام آلۂ کار بن رہی ہیں، مگر اصل میں اس کے پیچھے یہودی دماغ کار فرما ہے، تاہم اسلام نے کلمۂ سواء کی بنیاد پر جو اتحاد کی دعوت دی ہے، وہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہ دعوت پوری انسانیت کے لئے ہے، یہودیوں کی عداوت کو قرآن نے کھول کھول کر بیان کیا ہے، اس آیت میں ان کو بھی اشتراک کی دعوت دی گئی ہے۔

مذاہب اور قومیں اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتیں کہ ایک قوم دوسری قوموں کو نگل جائے، اور ایک تہذیب دوسری تہذیب کو اپنا لقمۂ تر بنا لینا چاہے، بلکہ فاصلے اس وقت گھٹیں گے، اور اجنبیت کی دیواریں اس وقت ٹوٹیں گی، جب ہم اسلام کے پیش کئے ہوئے ان دونوں اصولوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں، بقاء باہم اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت اور مشترک تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی قدروں پر قوموں کا باہمی اشتراک و تعاون!

(یکم فروری ۲۰۰۲ء)

دہشت گردی کا مسئلہ — حقیقت پسندانہ تجزیہ

جیسے کسی انسان کے لئے ہوا اور غذا سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی سماج کے لئے سب سے بڑی ضرورت امن و سلامتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے عربوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلاتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس وادی غیر ذی زرع میں بسنے والوں کو بھی غذا فراہم کی اور ان کے لئے بھوک سے نجات کا سروسامان پیدا کیا، دوسرے ایک ایسی سرزمین جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور لاقانونیت ہی سب سے بڑا قانون تھا، اللہ تعالیٰ نے اسی کو امن کی نعمت سے سرفراز فرمایا: أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (قریش: ۴)

دہشت گردی سماج کے امن وامان اور سلامتی کے لئے سم قاتل ہے، جو سماج مامون نہ ہو، جس معاشرہ میں ہر وقت انسان کو اپنی جان و مال کے بارے میں خطرہ لگا رہتا ہو اور جہاں ہر لمحہ انسان اپنی عزت و آبرو کے بارے میں اندیشہ سے دوچار ہو، وہاں علمی ترقی رک جاتی ہے، تہذیب وتمدن انحطاط پذیر ہونے لگتا ہے، اخلاقی پستی پیدا ہونے لگتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، اسی لئے دہشت گردی پر فکرمند ہونا اور اس کی وجہ سے خوف زدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ امن اور سلامتی اس کی خمیر میں داخل ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے اس نے دو لفظ استعمال کیا ہے "مومن" اور "مسلم" — دونوں ہی تعبیرات اسلام کی امن پسندی کا مظہر ہے، مومن امن سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو دوسروں کو امن دینے والا ہو اور مسلم "سلم" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح اور سلامتی کے ہیں، اسی طرح مسلم کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو صلح جو ہو اور جس سے دوسروں کو

طمانیت حاصل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض ارشادات سے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مومن وہ ہے کہ جس سے اس کے پڑوسی تکالیف سے امن میں رہیں۔ (بخاری ۲)

لیکن سب سے پہلے خود یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دہشت گردی ہے کیا؟ دہشت گردی دوسروں پر ظلم و تعدی اور جور و ستم کا نام ہے یا ظالم کے پنجہ کو توڑنے کی کوشش بھی دہشت گردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کا قائل نہیں ہوگا کہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں نے ان ظالم و جابر قوموں کے خلاف احتجاج کیا ہے جنہوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی اور آزادی کی اس لڑائی نے کتنی ہی انسانوں کی جانیں لیں اور ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی، تو کیا ان مجاہدین آزادی کو بھی دہشت گرد کہا جائے گا؟ خود ہمارے ملک ہندوستان میں نوے سال آزادی کی خونچکاں لڑائی لڑی گئی، یہ لڑائیاں اسی لئے ہوئیں کہ ہم انگریزوں کا طوق غلامی اپنی گردن سے نکال پھینکنے کے لئے بے چین تھے۔ اگر ہم غلامی کو برداشت کر لیتے تو یقیناً بہت سے انسانیت سوز واقعات پیش نہیں آنے ہوتے، تو کیا ہماری جدوجہد آزادی کو بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟

نہیں اور یقیناً نہیں!! تو معلوم ہوا کہ مظلوم کا سر اٹھانا اور ظالم کے خلاف اس کا صف آرا ہونا دہشت گردی نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کا مقابلہ ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس نے ظالم سے نبرد آزما ہونے کو ظلم اور دہشت کا نام دیا ہو۔ ہندوستان میں کورو اور پانڈو کی جنگ مشہور ہے اور اس موقع سے جناب کرشن جی نے ارجن کو جو اپدیش دیئے وہ آج بھی گیتا میں محفوظ ہیں۔ اس میں یہ پیغام ہے کہ اپنے جائز حق کے لئے اٹھ کھڑا ہونا اور بے انصافی کے خلاف سینہ سپر ہو جانا دہشت گردی نہیں، بلکہ ایک ''مقدس جہاد'' ہے۔ قرآن مجید نے بھی بڑی لطیف تعبیر میں کہا ہے کہ کسی بری بات کو کھلے عام کہنا خدا کو پسند نہیں، لیکن جو شخص مظلوم اور ستم رسیدہ ہو، اس کو یقیناً احتجاج کا حق حاصل ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء: ۱۴۸)

سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا (الشوریٰ ۴۰) اور آپ ﷺ نے فرمایا: لا ضرر و لا ضرار (ابن ماجہ ۲۳۴۰) یعنی نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ جوابًا نقصان پہنچانے میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

لیکن دہشت گردی کے علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان اسباب و محرکات پر غور کیا جائے اور ان کا سدباب کیا جائے جو شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دہشت گرد بنا دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر احساس محرومی اور قانونی راستہ سے حقوق کے تحفظ اور ناانصافیوں کے تدارک سے مایوسی اور ناامیدی دہشت گردی کو جنم دیتی ہے، کبھی معاشی محرومی، سرمایہ داری کے خلاف آتش اشتعال کو بھڑکاتی ہے، ہمارے ملک میں نکسلائیٹ تحریک اسی پس منظر میں ابھری ہے اور اسی احساس محرومی نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کو ان کے گرد اکٹھا کر دیا ہے، کبھی سیاسی محرومی دہشت گردی کا سبب بنتی ہے، کشمیر، پنجاب اور آسام اس کی کھلی مثال ہے، جن کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسی نے ان کو اس کی میز سے جنگ کا رزار میں پہنچا دیا ہے، کبھی اس کا سبب قومی ناانصافی اور فرقہ وارانہ زیادتی بھی ہوتا ہے، پھولن دیوی کا کردار اور مایاوتی کی اونچی ذات والوں کے خلاف دشنام طرازی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ان اسباب و عوامل پر توجہ نہ دینا اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے رد عمل کو دہشت گردی کا نام دے کر بزور قوت ختم کرنے کی کوشش، جڑ کے بجائے ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشکلات کی اصل بنیاد کو تلاش کرتا ہے اور اصل مرض کی شناخت کر کے اس کے علاج کی طرف اولین توجہ دیتا ہے۔ عرب جاہلیت سے زیادہ دہشت گردی اور ناقدریت شاید ہی تاریخ میں کہیں رہی ہو، لیکن اسلام نے نہایت خوبی سے اس کا علاج کیا اور ان ہی لوگوں کو جن کی دہشت ضرب المثل تھی، پوری دنیا میں امن کا پیامبر بنا کر کھڑا کیا۔ اسلام کو یہ کامیابی اسی لئے ملی کہ اس نے ان اسباب و عوامل پر توجہ دی۔ سب سے زیادہ جو چیز انسان کو دہشت گردی پر ابھارتی ہے وہ معاشی محرومی کا احساس ہے۔ اسلام نے اولاً تو آخرت کا یقین پیدا کیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو ایک

فانی اور آنی جانی چیز قرار دیا: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (الحدید:۲۰)

جب دلوں میں متاعِ دنیا کی محبت کم ہو جائے اور اس کی بے ثباتی کا یقین ہو جائے تو وہ دنیا کی محرومی کو آخرت کی سرفرازی میں تلاش کرنے لگا اور یہ احساس اس کو اہلِ ثروت کے خلاف بغاوت پر نہیں اکسائے گا، بلکہ وہ اپنے فقر وفاقہ میں بھی ایک لذت اور حلاوت محسوس کرے گا، پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز کو ناپسند کیا اور اس کی تقسیم اور گردش کے مربوط اور مرتب نظام کو وجود بخشا، میراث کا نظام، زکوٰۃ وصدقات، سود کی حرمت، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ایک جگہ دولت کو مرتکز نہیں ہونے دیتیں، ان کے علاوہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اخلاقی تعلیمات اس کے علاوہ ہیں، یہ وہ احکام ہیں جو اہلِ دولت میں انفاق کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور غربا کو محرومی کے احساس سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سیاسی سطح پر کسی طبقہ کو دبا کر رکھنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی، اسلام نے ذات اور برادری کی بنیاد پر عہدے اور سرداریوں کی تقسیم نہیں کی، بلکہ صلاحیت اور اہمیت کو اس کے لئے معیار بنایا، انصاف اور حفاظت وسلامتی کے باب میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کا بھی کوئی فرق نہیں کیا، آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے مال بھی ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون بھی ہمارے خون ہی کی طرح ہیں: دماءھم کدمائنا واموالھم کاموالنا، قرآن مجید نے عدل وانصاف پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی طبقے کی برائی تم کو ناانصافی کے راستے پر نہ لے جائے اور تم ان کے ساتھ بھی انصاف کا حق ادا کرو: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (المائدۃ:۸) مذہبی معاملات میں بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا: لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (القصص:۵۵) اسلام نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لیا جائے اور کچھ مجرموں کی وجہ سے بے قصور لوگوں کو نشانۂ انتقام بنایا جائے، لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر:۱۸) اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احتجاج کا قانونی راستہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے، اگر احتجاج مبنی بر حقیقت ہے تو اسے قبول کیا جائے اور اگر خلاف

واقعہ ہے تو ان کو مطمئن کیا جائے، ملک نے ایک عام شہری کو بھی جو حق دیے ہیں، اسے حکمراں کو روکنے اور ٹوکنے کا حق حاصل ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں ''نہی عن المنکر'' اور ''شہادتِ حق'' ہے۔ اگر یہ لوگ غیر سنجیدہ طریقۂ تخاطب اختیار کریں تو ان کا بھی بہتر طریقہ پر جواب دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: برائی کو نیکی کے ساتھ دور کرو: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ (مومنون: ۹۶) گویا اسلام جوابی دہشت گردی کو بھی پسند نہیں کرتا۔

اسلام سراپا رحمت اور امن و آشتی ہے، وہ عدل و انصاف کا نقیب ہے، رحم اور عفو و درگذر سے زیادہ کوئی چیز اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں، ظلم و جور اور ناانصافی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اس مذہب میں مبغوض ہو، جس نے خدا کو جس نام سے بار بار یاد کیا وہ ''رحمٰن و رحیم'' ہے اور جس نے اپنے پیغمبر کو جس لقب سے ملقب کیا ہے وہ ''رحمۃ للعالمین'' ہے، اس کا مزاج یہ ہے کہ معلوم ہے کہ دینی پیشواؤں پر بھی تلوار نہیں اٹھائی جاتی، جو خود نہ لڑے، بچوں اور عورتوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ کیا ایسے مذہب کی طرف دہشت گردی کی نسبت کرنا دن کو رات کہنے کے سوا اور کیا ہے؟ درحقیقت یہ ایک نعرہ ہے جس میں بہت سی قوموں نے آج اپنی دہشت گردی کو چھپایا ہے۔ دہشت گردی مظلوموں کی آہ و فغاں، صدائے احتجاج اور ظلم سے نجات پانے کا نام نہیں، بلکہ دہشت گردی خود ظلم و تعدی کا نام ہے، مگر افسوس کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(۷ نومبر ۲۰۰۰ء)

مسلم پرسنل لا: ایک غلط فہمی کا ازالہ

آج کی ترقیات اور انکشافات نے زندگی کی قدریں یکسر تبدیل کر دی ہیں، جو کل رینگتا تھا، وہ آج برق رفتار سواریوں کو وجود میں لا چکا ہے اور ہوا کے دوش پر اڑ رہا ہے، کل تک دو دیز کی معمولی موجیں بس کے لئے ایک ناقابلِ تسخیر مصیبت تھی، آج وہ سمندر کا جگر چیر کر لعل و جواہر کی دنیا سمیٹ رہا ہے، کل کا لکڑیاں جلانے اور چراغ میں تیل ڈالنے والا آج برقی، آلات و وسائل کی مدد سے پوری دنیا کو اپنی مٹھی کی گرفت میں لے چکا ہے، کل تک جو اپنی نحیف آواز میل دو میل کے فاصلے پر پہنچانا بھی ممکن تصور نہ کرتا تھا، آج کی حیرت انگیز ایجادات نے اس کی آواز کو آفاقی بنا دیا ہے اور اس کی آواز بیک وقت ایک دو شہر نہیں پوری کائنات میں پھیل سکتی ہے۔ پھر آخر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس دور کا قانون آج کی اس ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکے اور ان کے لئے مشعلِ راہ بن سکے!

اس دلیل کو ہمارے مغرب زدہ اور علومِ اسلامی سے نا آشنا حضرات نے ایک مسلّمہ شدہ حقیقت تصور کر لیا ہے کہ گویا اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے، حالانکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو چیز بدلتی رہی ہے اور بدل رہی ہے، وہ کیا ہے؟ کیا انسان کی فطرت بدل گئی ہے؟ اس کے طبعی تقاضے تبدیل ہو گئے ہیں؟ یا محض وسائل اور اسباب میں تغیر رونما ہوا ہے؟ ذرائعِ زندگی میں فراوانی آئی ہے؟

اس نکتہ پر جب کوئی شخص غور کرے گا تو اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ ازل سے آج تک دنیا میں جو انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں اور جو تبدیلیاں پیدا ہوتی رہی ہیں، ان کا تعلق اسباب و وسائل کی دنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کی

"اچھائی" اور "جھوٹ" کو ایک "پاپ" تصور کیا جاتا تھا آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی جھوٹ کو کوئی "کارِ خیر" تصور نہیں کیا جاتا، جس طرح کل "ایفاءِ عہد" محبوب تھا آج بھی "عہد شکنی" معیوب ہے اور جس طرح کل "ایمانداری" اور "انصاف" پسندیدہ تھی آج بھی "خیانت" اور "ظلم و جور" مذموم ہے۔

معلوم ہوا کہ عہدِ حاضر کی ترقیاں اور تبدیلیاں جو بے شک بڑی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہوں، وہ ترقی کی بالائی اور رانو کی ہوں، بہر حال انہوں نے جو اب وسائل میں کسی قدر اضافہ کر دیا ہے اور انسان کے لئے زندگی میں راحت کے کچھ سامان فراہم کر دیئے ہیں، مگر وہ چیز جسے "انسان" کہتے ہیں اور جسے "انسانی فطرت" کہا جا سکتا ہے، وہ ایک ایسی غیر متغیر چیز اور حقیقت ہے جسے زمانے کی گردش اور وقت کا تیز رو قافلہ بھی متاثر نہیں کر سکتا۔

اس مرحلے پر آکر ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام اور اس کے قانونی نظام کا اصل موضوع اسباب و وسائل نہیں ہیں، بلکہ اس کا موضوع انسان، اس کی فطرت اور اس کے فطری تقاضوں کی مناسب حدود میں تکمیل ہے، لہٰذا جس طرح انسان ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اسی طرح ظاہر ہے اس سے تعلق رکھنے والا قانون بھی ابدی اور دائمی ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود بلا شبہ ان نو بہ نو ذرائع و وسائلِ زندگی، بدلتے ہوئے عرف اور زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے میں غیر معمولی تبدیلی ضروری ہے کہ قانون میں اس کی خصوصی رعایت کی جائے اور ان کے تقاضوں اور وسائل سے قانون کو ہم آہنگ کیا جائے اور جزوی اور فروعی حدود میں اسلام ان تقاضوں کو قبول کرے۔ اس ضمن میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام نے بعض قانونی اور فکری امتیازات اور بنیادی اصولوں کو جوں کا توں باقی رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد میں ضروری تغیر و تبدل اور عملی تقاضوں کی تکمیل کے لئے اتنی لچک باقی رکھی ہے جو اس کو فرسودگی سے بچائے رکھے، چنانچہ مشہور فقیہ اور مزاجِ شریعت کے رمز شناس حافظ ابن القیم (۱۲۹۱ـ۱۳۵۰) اپنی گرانقدر کتاب "اعلام الموقعین" میں اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عرف و عادت، حالات و مقاصد اور زمان و مکان کے تغیر کی بنا پر

مسائل میں اختلاف، اور تغیر و تبدل کا بیان، یہ بڑی تفصیلی اور اہم بحث ہے،
جس سے عدم تفقہ کی بنا پر شریعت میں بڑی غلطیاں واقع ہوتی ہیں، جن سے
دشواری، تنگی اور استطاعت سے باہر تکلیف پیدا کردی ہے، جب کہ یہ بات
معلوم ہے کہ شریعت جو مصالح کی غیر معمولی رعایت کرتی ہے، ان نا قابل
برداشت کلفتوں کو گوارا نہیں کرتی، اس لئے کہ شریعت کی اساس سراپا رحمت
اور سراپا مصلحت ہے، لہٰذا جب کوئی حکم عدل کے دائرہ سے نکل کر ظلم و زیادتی،
رحمت کی حدوں سے گذر کر زحمت، مصلحت کی جگہ خرابی اور کار آمد ہونے
کے بجائے بیکار قرار پائے تو وہ شرعی حکم نہیں ہوگا۔ (اعلام الموقعین ج ۳)

جس قانون میں ایک ایسا تغیر پذیر اور لچکدار پہلو موجود ہو، اور وہ ہر دور کے سیاسی، اخلاقی حالات، جدید اکتشافات و تغیرات اور رسوم و عادات کے تحت مناسب تبدیلی کو گوارا کر لیا کرتا ہو اور جس کی اسی وسعت نے اس کو چودہ سو سال تک مسلسل زندہ اور پائندہ رکھا ہو اور تمام انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اس کی روشنی میں حل کئے جاتے رہے ہوں، اس کو جامد اور کسی زمانے کے لئے ناکارہ کہنا سوائے عناد کے اور کیا ہے؟! اس قسم کی باتیں عموماً ہمارے مسلمان قانون داں ہی "ارشاد" فرماتے رہتے ہیں، حالاں کہ بعض غیر مسلم ہندو اور مستشرقین ماہرین قانون نے عموماً اسلامی فقہ کی تعریف کی ہے اور اس کی افادیت کا اعتراف کیا ہے، چند سال قبل دہلی میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں سابق جج سپریم کورٹ مسٹر وی، آر کرشنا آئر نے کہا کہ: "یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی سول کوڈ میں اسلامی قانون کی کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ مستقبل میں اسلامی اصول قانون، ہندوستانی سول کوڈ کا ایک بڑا عنصر بن کر رہے گا۔" اسی سپریم کورٹ کے دوسرے جج نے اپنی تقریر میں کہا کہ "ہندوستان کے نظام قانون میں اسلام کی دین کسی سے کم نہیں ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندوستان کے قوانین میں اصولی حیثیت سے اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش کریں۔" (صدق جدید، ۱۳ فروری ۱۹۸۸ء)

(۱۳/ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

یونیفارم سول کوڈ ـــ حقیقت پسندانہ جائزہ!

یونیفارم سول کوڈ، تین انگریزی کے الفاظ کا مجموعہ ہے، یونیفارم کے معنی یکساں کے ہیں، اور سول کوڈ شہری قانون کو کہتے ہیں، اس طرح ''یونیفارم سول کوڈ'' ایسے شہری حقوق کا نام ہوگا جس میں نسل ونسب، علاقائی عرف وعادت، مذہب واعتقاد، مخصوص سماجی کلچر اور زبان وادب کے اختلاف کے باوجود سبھوں کے لئے یکساں قوانین بنائے جاتے ہیں۔

''سول کوڈ'' کا ایک حصہ ایسا ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان امور میں آزادی سے پہلے بھی یکساں قوانین تھے، اب بھی ہیں، اور ان کو ہندوستان کے مخصوص ڈھانچے کے اعتبار سے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق ''مذہبی قوانین'' سے ہے، مثلاً نکاح، طلاق، وراثت، وصیت، ہبہ وغیرہ، ہندوستان کی تاریخ میں مسلم عہد حکومت سے پہلے بھی، مسلم عہد حکومت میں بھی اور برٹش راج میں، انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس حصہ کے قانون میں ہر مذہب کے ماننے والے آزاد رہے ہیں اور اس کو ایک ''حق'' کی حیثیت سے ہندوستانی قانون میں بنیادی حقوق کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے۔

بدقسمتی سے آزادی کے بعد ہندوستان میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کا ایسا خاکہ پیش کیا جانے لگا جس کی روشنی میں ''پرسنل لا'' بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح ''مسلم پرسنل لا'' پر خط تنسیخ پھیر کر مذہبی امور میں بھی ''یکساں قانون'' بنانے کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی، یونیفارم سول کوڈ کی سب سے بڑی مصلحت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ ''قومی یکجہتی'' اور ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' پیدا ہوگی، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خلیج کم ہو سکے گی، اور ''فرقہ وارانہ کشیدگی'' دور ہوگی۔

حکومت کی یہ فکر لائق صد تحسین ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ''واقعی'' یونیفارم

سول کوڈ" سے یہ مقصد حاصل ہو سکے گا، اور کیا آج جو فرقہ وارانہ تناؤ پایا جاتا ہے اور جو شیعہ، دیوبندی، بریلوی، مسلم، غیر مسلم اور عورت مرد کی تفریق کے نتیجے میں واقعات سامنے آتے ہیں، وہ "اسی مذہبی امتیاز" اور تشخص کا نتیجہ ہیں؟

تجربات اور ہمارے ملک کے حالات شاہد ہیں کہ ایسا نہیں ہے، جہاں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور فسادات ہوتے ہیں وہاں ہندو، مسلمان سے یا مسلمان، ہندو سے یہ نہیں پوچھتا کہ ذرا آپ اپنے قوانین بیان فرما دیجئے، اگر میرے مذہب کے مطابق ہو تو بخش دوں گا، ورنہ آپ کی گردن سے جدا کیئے دیتا ہوں، وہاں تو صرف مذہب کا نام پیش نظر ہوتا ہے۔ ایک مسلمان، ہندو تہذیب سے کتنا بھی قریب کیوں نہ ہو، اگر وہ غریب "مسلمان" کہلاتا ہے تو گردن زدنی ہے بلکہ ہندوستان کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں "مسلم پرسنل لا" سے ہٹ کر ہونے والے نکاح بڑے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں اور جب بھی کوئی "بین مذہبی" نکاح ہوتا ہے تو پورا علاقہ ایک طرح کے تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

اگر قوانین کی یکسانیت اس ہم آہنگی کے لئے کافی ہوتی تو بنگال میں بنگالی، غیر بنگالی اور آسام میں آسامی، غیر آسامی کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا، ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی باہمی کشاکش دیکھئے، پاکستان کے مختلف صوبوں کا آپسی تناؤ ملاحظہ کیجئے آخر یہاں کے ہندو اور وہاں کے مسلمان "قوانین کی یکسانیت" کے باوجود باہم کیوں دست و گریباں ہیں؟

دوسرے اگر "قومی یکجہتی" کے نام پر آج مسلم پرسنل لا کو منسوخ کر دیا جائے تو یہ سلسلہ یہیں رک نہ سکے گا، اس کے لئے یہ بات زیادہ ضروری ہوگی کہ عبادت گاہوں کا امتیاز بھی ختم ہو جائے، تیوہار اور مخصوص مذہبی دنوں کی تفریق بھی مٹا دی جائے۔ حرام و حلال اور کھانے پینے میں بھی نظریاتی یکسانیت پیدا کی جائے، اگر "قومی یکجہتی" کی قربان گاہ پر اس طرح مذہبی اقدار کو بھینٹ چڑھایا جاتا رہے اور اگر یہی حکومت کا منشا ہے تو صرف "مسلم پرسنل لا" کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ اس کام کے لئے ہندوستان سے مذہب کی یکسر بیخ و بن اکھاڑ دی جائے گی ــــ اور یہ شاید ممکن نہیں، کیوں کہ مذہب

ہندوستان کے خمیر میں داخل ہے، جسے ختم کرنے کی کوشش ناکام ہی رہے گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کم از کم اس کے ذریعہ تہذیب میں یکسانیت اور وحدت تو پیدا ہو سکے گی۔ مگر یہ بجائے خود ایک بچکانہ بات ہے۔ اولاً تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کا اصل حسن تہذیب کی اسی رنگارنگی میں مضمر ہے اور ماضی بعید سے ہندوستان کا یہی امتیاز رہا ہے کہ "گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن" ——— اور اسے مٹایا بھی کہاں جا سکتا ہے؟ آپ قانون ایک کر دیں گے لیکن کیا سب کو ایک ہی بات سوچنے پر مجبور کر دیں گے؟ پھر کوئی سرد علاقہ کا رہنے والا ہے، کوئی گرم علاقہ کا، ہر خطہ کی آب و ہوا، وہاں کی بود و باش، لباس و پوشاک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں گے، کیا ان میں بھی اتحاد پیدا کیا جائے گا؟ ایک شخص جو پہاڑی اور جنگلاتی علاقوں میں رہتا ہے، دوسرا شخص جو زرخیز اور ہموار سرزمین میں زندگی بسر کرتا ہے، تیسرا شخص جو جنگلوں کے اطراف و جوانب کا رہنے والا ہو، کیا ان سب کی تہذیب میں کچھ فرق نہ ہوگا؟ اور پھر کیا ان کے مخصوص حالات کی وجہ سے جو تہذیبی اور تمدنی تشخص ہوگا، آپ اسے مٹا دیں گے؟ اور مٹانے پر قادر بھی ہوں گے؟

آپ قانون میں لاکھ یکسانیت پیدا کر لیں، ایک راجستھانی اور ایک لکھنوی، ایک آسامی اور ایک کشمیری، ایک بنگالی اور ایک حیدرآبادی کی تہذیب میں جو فرق ہے، وہ بہر حال باقی رہے گا، ان کی زبانیں جداگانہ ہوں گی، ان کے لب و لہجہ میں اختلاف ہوگا، ان کے مزاج اور عادتوں میں فرق ہوگا، ان کے انداز و اطوار الگ ہوں گے، تہذیب اور سماج کی ان ساری "دوئیوں" کے باوجود آخر قانون ہی میں "اکائی" پیدا کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوگئی ہے؟

بعض حضرات اس تہذیب فروشی کو رواداری کا تقاضا سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کا نام رواداری ہے اور نہ اسلام ایسی "رواداری" کا قائل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جہاں سب اپنا تشخص برقرار رکھے، قانون اور عقیدہ تو بہت اہم چیز ہے، وہ تو وضع قطع اور لباس و پوشاک میں بھی بہت حساس واقع ہوا ہے۔ ایام جاہلیت میں عرب صرف لنگی استعمال کرتے تھے

یہ صرف ٹوپی، رسول اللہ ﷺ نے ان کے طرزِ عمل اور مشابہت سے بچنے کا حکم دیا کہ عمامہ و ٹوپی دونوں کا استعمال کیا جائے۔ پھر بعد کو جب پورا جزیرۃ العرب مسلمان ہو گیا تو آپ نے صرف "ٹوپی" اور صرف "عمامہ" کے استعمال کی بھی اجازت دے دی ۔۔۔ یہاں تک کہ اسلام تو "عمل خیر" کی انجام دہی میں بھی اپنے آپ کو ممتاز رکھنا چاہتا ہے، یوم عاشورہ (۱۰ محرم) کو یہود بھی روزہ رکھتے تھے تو آپ نے مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا، لیکن ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے ایک اور روزہ کا اضافہ کر کے "دو روزہ" رکھنے کی تلقین کی گئی جو مذہب اپنے تشخص اور امتیازات کے معاملہ میں اتنا حساس ہو وہ اس رواداری کو کیسے قبول کر سکتا ہے؟ ہاں! اسلام بے شک مذہبی رواداری کا قائل ہے مگر "رواداری" وہ شئی ہی نہیں جس کے لئے آج اس کا نام استعمال کیا جاتا ہے، "مذہبی رواداری" کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ اپنے عقیدہ، مذہب، تہذیب اور معاشرت پر پوری استقامت اور جماؤ کے ساتھ دوسروں کے "مذہبی اقدار" کا بھی احترام کیا جائے، ان کی عبادت گاہوں اور مذہبی طور طریقوں کے ساتھ تمسخر نہ کیا جائے اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہونچانے والی دل آزار باتیں نہ کی جائیں اور اس حیثیت سے واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی رواداری کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی، اسلامی مملکت کی اقلیت کو اس سے زیادہ "مذہبی آزادی" دیتا ہے جو آج کی سیکولر حکومتوں میں حاصل ہے۔ وہ ان کو عبادتوں کی، اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی جائز حدود میں اسلام پر فکری اور عقلی تنقید کی اور اپنے عائلی قوانین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دیتا ہے، لیکن تہذیب فروشی کا قائل نہیں ہے اور اس معاملہ میں وہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے ساتھ بھی یہی رویہ رکھتا ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں غیر مسلم ایرانیوں کو بھی "عربی اسلامی لباس" اختیار کرنے سے منع کیا تھا۔

(۹/۱ [illegible] ۲۰۰۰ء)

عورت اور اسلام

آج ۸ مارچ ہے۔ آج کے دن کو "عالمی یوم حقوقِ نسواں" کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ تو آئیے! ہم آج کے دن کی مناسبت سے جاننے کی کوشش کریں کہ اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق عطا کئے ہیں اور ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کی ذات یوں تو سوکھی ہوئی خزاں رسیدہ انسانیت کے تمام طبقوں پر ابر بہار بن کر برسی، لیکن خاص طور پر دو طبقے اس وقت سب سے زیادہ مظلوم، ستم رسیدہ اور قابلِ رحم تھے اور نہ صرف عرب بلکہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تمام علاقوں میں ان کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی، روم اور ایران کے لوگ اس زمانے میں تہذیب و تمدن، علم و ہنر اور شائستگی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، مگر وہاں بھی ان کی حالت بدتر تھی۔ یہ دو طبقے تھے غلاموں کے اور خواتین کے، اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ انہی دونوں طبقوں کی دستگیری اور غم گساری کی، ان کو اونچا اٹھایا اور سماج میں عزت و احترام کا مقام دیا۔ یہ اسلامی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ غلامی کا جو رواج ہزاروں سال سے چلا آرہا تھا، چند سو سالوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا اور اسلام ہی کے اثر سے یورپ اور دنیا کے مختلف علاقوں میں عورتوں پر ظلم کے خلاف تحریکیں اٹھیں اور اس کو ایک اہم سماجی مسئلہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔

اسلام سے پہلے عورت کو جائداد کی حیثیت دی جاتی تھی۔ قرآن مجید نے یہ تصور دیا کہ عورت مردوں ہی کی طرح انسانیت کا مستقل حصہ ہیں (الحجرات: ۱۳، النساء: ۱) چونکہ تورات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کے باعث حضرت حواء تھیں، اس لئے یہودی اور عیسائی مذہب میں عورت کو گناہ کا دروازہ تصور کیا جاتا تھا۔

قرآن مجید نے اس الجھن میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا دونوں کو ذمہ دار قرار دیا، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا اور فرمایا آدم نے (یعنی کہ) اپنے رب کے حکم کے خلاف کیا اور وہ پھسل گئے "وعصى آدم ربه فغوى" (طٰہٰ: ۱۲۱) یہ قرآنی فقرہ عقیدہ کے اعتبار سے بہت بڑا انقلاب تھا، جس کے ذریعہ ہزاروں ہزار سال سے جاری غلط فہمی کو دور کیا گیا۔ اسلام سے پہلے عام طور پر عورتوں کو جائیداد کے مالک بننے اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے وغیرہ کا حق نہیں تھا۔ اسلام نے عورتوں کو جائیداد میں مالک بننے اور اپنی مرضی سے اس میں عمل کرنے کا پورا اختیار دیا۔ (النساء: ۳۲)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق دیئے ہیں اور ان کی لطافت و نزاکت کی جتنی رعایت کی ہے، اس سے زیادہ بہتر طور پر کوئی اور مذہبی یا انسانی قانون عورتوں کی مشکلات کو حل نہیں کرتا۔ عورتیں عام طور پر جن مرحلوں سے گزرتی ہیں: بیٹی، بیوی اور ماں، بعض دفعہ ناخوشگوار حالات میں ایسی صورت بھی پیش آ جاتی ہے کہ ایک عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جاتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اسلام نے ان مختلف مرحلوں میں عورتوں کو کیا حقوق دیئے ہیں، اور ان کے مسائل کس طرح حل کئے ہیں؟

بیٹی: رسول اللہ ﷺ نے بیٹی کی پرورش پر بڑا اجر و ثواب بتایا ہے۔ فرمایا کہ جس کو دو یا ایک لڑکی ہو اور وہ ان کی اس طرح پرورش کرے کہ تعلیم دے، بہتر طور پر تربیت کرے تو جنت میں اس کو میرا ساتھ اسی طرح حاصل ہوگا، جیسے یہ دونوں (شہادت اور بیچ کی) انگلیاں (ترمذی ۲/۱۳، باب البر والصلۃ) اس طرح کی خوش خبری آپ ﷺ نے لڑکوں کی پرورش پر بھی نہیں دی ہے۔ لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر افسردہ اور غمگین ہو جایا کرتے تھے اور بدقسمتی سے بے دینی اور جہالت کی وجہ سے آج کل بھی بعض مرد اور ان کے خاندان کے لوگ بچیوں کی پیدائش پر آزردگی کا اظہار کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس طرح کی سوچ کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ (الزخرف ۱۷)

شریعت میں لڑکیوں کی پرورش اور ان کی تمام ضروریات کی تکمیل اس وقت تک باپ کے ذمہ رکھی ہے جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے۔ لڑکے بالغ ہو جائیں تو

والدین کمتر حالات میں اس کے اخراجات کا ذمہ دار نہیں، بلکہ لڑکیوں کے بالغ
ہونے کے بعد بھی ان کے اخراجات اس وقت تک باپ پر واجب ہیں جب تک کہ شادی
نہ ہو جائے اور وہ سسرال نہ چلی جائے۔ (عالمگیری ۱/۵۶۳) پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی
ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش میں والدین کے لئے جائز نہیں کہ وہ لڑکوں کے ساتھ
ترجیحی سلوک کریں اور لڑکیوں کے ساتھ کمتر درجہ کا سلوک۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس
کو لڑکی ہو، وہ اس کو زندہ دفن نہ کرے، اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہ کرے اور لڑکوں کو اس
پر ترجیح نہ دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (ابوداؤد ۲/۷۰۵)

بالغ ہونے کے بعد ماں باپ اور خاندان کے بڑوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ
لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح کردیں اور اس پر اپنی پسند کو تھوپیں۔ رسول اللہ ﷺ
نے اس بات کو ضروری قرار دیا کہ نکاح میں لڑکیوں کی رضامندی دریافت کی جائے۔
(بخاری ۲/۷۷۱) ایک خاتون نے آپ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی کہ ان کے والد نے
ان کی اجازت کے بغیر نکاح کردیا ہے، آپ ﷺ نے اس نکاح کو رد فرمادیا۔ (بخاری ۲/۷۷۱)
اگر نابالغی کی حالت میں باپ دادا کے علاوہ کسی اور سرپرست نے نکاح کردیا ہو، یا باپ
دادا ہی نے کیا ہو لیکن وہ معاملات کی ناتجربہ کاری میں معروف ہوں تو بالغ ہونے کے
بعد لڑکی کو اس نکاح کے رد کردینے کا حق حاصل ہے۔

زندگی میں اگر والدین اپنی جائداد بچوں میں تقسیم کرکے ان کے حوالہ کردینا چاہیں،
تو واجب ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر حصہ دیں۔ اسی طرح اگر والدین کے زیر پرورش
رہتے ہوئے کوئی شخص رقم یا جائداد ہبہ کرے، تو لڑکی خود اس کی مالک ہوگی اور والدین
وغیرہ کو لڑکی کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔
والدین کی وفات کے بعد جائداد میں شریعت نے لڑکیوں کا بھی حصہ رکھا ہے اور یہ حصہ
لڑکوں کے مقابلے آدھا ہے۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ، بیٹے، نابالغ بھائی بہن، مطلقہ اور بیوہ
بہنیں اور تمام ان کے وارث ہیں، اور رشتہ دار، دادا، چچا، پھوپھی، بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے،
بھانجیاں وغیرہ کی پرورش کی ذمہ داریاں عام طور پر مردوں ہی پر رکھی گئی ہیں، اس لئے بیٹے کا

حصہ بہ مقابلہ بیٹی کے دوگنا رکھا گیا ہے۔

اگر بھائی کا انتقال ہوا، جو لا ولد تھا اور اس نے تنہا ایک بہن کو چھوڑا تو وہ نصف جائداد کی حقدار ہوگی، اگر صرف دو بہنیں تھیں تو ایک ایک تہائی دونوں کا حصہ ہوگا اور اگر اس کے بھائی بھی ہیں تو بھائی کے مقابلہ نصف حصہ بہنوں کو ملے گا، اس طرح مختلف رشتہ داروں سے بہن حصہ وراثت پاتی ہے۔

بیوی: شریعت میں بیوی کو کافی حقوق دیئے گئے ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کو کسی مرد کے بہتر ہونے کا معیار قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جس کا سلوک اپنی بیوی کے ساتھ بہتر ہو اور میں اپنی بیوی کے ساتھ تم سب کے مقابلہ بہتر سلوک رکھتا ہوں۔

(ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوۃ ۲۸۱/۲)

بیوی اپنی تمام جائداد اور سامان کی خود ہی مالک ہے، اس کو اپنے والدین کی طرف سے میراث یا تحفہ کے طور پر جو کچھ ملے، وہ اس کی ملکیت ہے، اسی طرح شادی کے وقت یا اس سے پہلے اور اس کے بعد شوہر یا اس کے اہل خاندان نے تحفتاً عورت کو جو کچھ دیا ہو، وہ سب اس کی ملک ہے، شوہر اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام چیزوں میں عورت ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہے، شوہر یا دوسرے اہل خاندان اس کو روک نہیں سکتے۔

بیوی کا نفقہ یعنی کھانے، پینے، دوا علاج اور کپڑے وغیرہ کی تمام ضروریات شوہر کے ذمہ ہے، چاہے بیوی بذات خود خوش حال ہو اور مرد تنگ دست ہو، پھر بھی نفقہ شوہر پر واجب ہوگا (البحر الرائق ۴/ ۱۸۸) اگر بیوی شوہر کے بے جا ظلم سے بچنے کے لئے یا اپنے کسی جائز حق کے مطالبہ کے لئے اپنے میکے میں رہے تو میکے میں رہنے کے باوجود اس کے اخراجات شوہر پر واجب ہوں گے۔ (حاشیہ ۲/ ۵۷۵) کھانے، پینے، رہائش اور لباس و پوشاک میں شوہر پر واجب ہوگا کہ بیوی کے اہل خاندان کی رعایت کرے مثلاً اگر کسی شخص کے یہاں رہنے سہنے کا معیار کمتر ہے اور اس کے سسرال میں معیار زندگی اونچا ہے تو وہ عورت کے لئے درمیانی درجہ کا معیار فراہم کرے۔ (ہندیہ ۱/ ۵۴۴) بیوی اگر

صاحبِ جائیداد بھی ہو تب بھی بال بچوں کے اخراجات شوہر پر ہی واجب ہوں گے۔ اگر شوہر معاشی اعتبار سے خوش حال ہو تو اس پر یہ بھی واجب ہے کہ بیوی کی امورِ خانہ داری میں مدد کے لئے نوکر یا نوکرانی کا انتظام کرے۔ (ہدایہ ۲/۴۱۱) اگر شوہر بیوی کے اخراجات نہیں ادا کرسکتا ہو یا صلاحیت رکھنے کے باوجود ادا نہیں کرتا ہو تو عورت کو حق ہے کہ وہ قاضی شریعت سے رجوع کرکے اپنا نکاح تڑوا لے۔

اگر بیوی سسرال کے لوگوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے اور اگر ایسا کرنا مصلحت کے خلاف نہ ہو تو شوہر کو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ (ہدایہ ۲/۴۲۳) شوہر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بیوی کے والدین یا اس کے محرم رشتہ داروں کو آنے سے منع کرے۔ (ہدایہ ۲/۴۲۴) اگر وہ خود والدین یا دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملنا چاہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر اس کا میکہ شہر میں ہے تو جمعہ میں ایک دن والدین کے یہاں اور مہینہ میں ایک دن دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے جا سکتی ہے اور شوہر کو کسی معقول عذر کے بغیر اس سے نہیں روکنا چاہئے۔ (عالمگیری ۱/۵۵۶) البتہ غیر محرم مردوں سے ملنا سخت منع اور گناہ ہے۔

بیوی کو گالی گلوچ کرنا، اس کی صورت یا کسی اور بات پر طنز کرنا حرام و سخت گناہ ہے۔ قرآن مجید نے بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تاکید کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم کو اس میں کوئی خامی نظر آئے تو یہ سمجھ کر نظر انداز کردو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے والدین کی طرح اس میں کوئی بڑی بہتری بھی پیدا کرسکتا ہے (النساء: ۱۹) شریعت میں والدین کی طرح شوہر سے بیوی کو بھی میراث ملتی ہے۔ اگر شوہر صاحب اولاد ہو تو بیوی کو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کا آٹھواں (۱/۸) حصہ ملے گا اور وہ لا ولد ہو تو چوتھائی حصہ (۱/۴)۔ (نساء ۱۲)

بیوی کا ایک نہایت اہم حق "مہر" ہے، یہ اتنا اہم حق ہے کہ اگر نکاح مہر نہ دینے کی شرط پر ہوا ہو تب بھی مہر واجب ہو کر ہی رہے گا۔ قرآن مجید نے مہر ادا کرنے کی خصوصی تاکید کی ہے (نساء: ۴) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نکاح کیا اور مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں تھا تو ایسا شخص زانی ہے (مجمع الزوائد: ۴/۲۸۴)

بھائی کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی جائز شرعی ضرورت کی بنا پر مرد دوسرا نکاح کرے تو دونوں بیویوں کے درمیان مکمل عدل و انصاف سے کام لے، یہاں تک کہ لباس و پوشاک، کھانے پینے کے سامان اور رات گذارنے کے اوقات میں پوری طرح برابری برتی جائے۔ بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنا حرام اور سخت گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کی بڑی مذمت فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو تو اس کے لئے دوسری شادی درست نہیں۔ (نساء: ۳)

بیوہ و مطلقہ: بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو شریعت نے دوسرے نکاح کی اجازت دی ہے، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے، خود قرآن مجید نے اس کی طرف توجہ دلائی ہے (نور: ۳۲) اور اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ اگر وہ خود نکاح کرنا چاہیں تو اس میں رکاوٹ بنا جائے۔ (بقرہ: ۲۳۲) خود رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا اور نکاح فرمائے، جن میں سے بیشتر نکاح بیوہ اور مطلقہ خواتین سے کئے۔

ایسی خواتین کو شریعت نے بے سہارا نہیں چھوڑا ہے، بلکہ والدین اور دوسرے محرم رشتہ داروں پر ان کی کفالت واجب قرار دی ہے۔ (طبرانی ۲/۳۹۲) اور یہ کوئی احسان اور اخلاقی حق نہیں بلکہ ایسی عورتوں کا قانونی حق اور محرم رشتہ داروں پر شرعی فریضہ ہے۔ یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو اور شوہر کا انتقال ہو جائے تو شوہر کے متروکہ میں سے اولاً بیوی کا مہر ادا کرنا واجب ہے اور شوہر کے انتقال کے بعد جنازہ کے سامنے بیوی سے مہر معاف کروانا درست نہیں ہے، ورثاء کا فریضہ ہے۔ ورثاء کو چاہئے کہ اولاً بیوہ کا مہر ادا کرے، پھر جو کچھ رہ جائے اس کو حکم شرعی کے مطابق تمام ورثہ میں تقسیم کرے۔

مطلقہ عورت کو شریعت نے یہ خصوصی حق دیا ہے کہ لڑکیاں جب تک بالغ نہ ہو جائیں اور لڑکے سات آٹھ سال کی عمر کو نہ پہنچ جائیں اور اپنی ضروریات (یعنی کھانے، پینے، استنجاء وغیرہ) خود پوری کرنے کے لائق نہ ہو جائیں، ماں ان کی پرورش کرنے کی زیادہ

کا انتقال ہو جائے تو نانی کو حقِ پرورش حاصل ہوگا اور جب تک بچے زیرِ پرورش رہیں گے، ان بچوں کا نفقہ تو باپ کے ذمہ رہے گا ہی، پرورش کرنے والی خاتون کی اجرت بھی اسی کے ذمہ واجب ہوگی۔ اس طرح جو مطلقہ عورتیں صاحبِ اولاد ہوں، طلاق کے بعد عرصہ تک اس ذریعہ سے ان کی ضروریات کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

ماں: قرآن و حدیث میں سب سے زیادہ جن لوگوں کے حقوق کی تاکید زیادہ وارد ہوئی ہے، وہ والدین ہیں اور والدین میں بھی ماں کا درجہ زیادہ رکھا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ (مشکوٰۃ:۲/۴۲۱) ایک شخص نے دریافت کیا: ہمارے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں، وہ تین بار یہ سوال دہراتے رہے، آپ ﷺ نے تین دفعہ ماں اور چوتھی دفعہ باپ کا ذکر فرمایا۔ (ابوداؤد ۲/۷۰۰،۷۰۲) قرآن مجید میں بھی ماں کے حقوق و احسانات خاص طور پر ذکر فرمائے۔ (لقمان:۱۴، احقاف:۲) اگر ماں حاجت مند ہو تو اس کی کفالت اولاد پر واجب ہے (ہدایہ ۲/۴۴۶) یہاں تک کہ اگر ماں مسلمان نہ ہو تب بھی اس کا نفقہ ادا کرنا واجب ہے اور اگر وہ خود صاحبِ جائیداد اور مالی اعتبار سے خود مکتفی ہو، تب بھی اولاد کو چاہئے کہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کچھ اس کی خدمت میں پیش کیا کرے۔ یہ بھی اولاد کا فریضہ ہے کہ نہ ماں کی طرف سے بیوی پر ظلم ہونے دے اور نہ بیوی کی طرف سے ماں پر۔ ماں کے اخراجات کی کفالت کے علاوہ ان کا اکرام، ان کی خدمت اور جائز باتوں میں ان کی اطاعت واجب ہے۔ اگر ماں کسی ناجائز بات کا حکم دے، تو اس کا ماننا جائز نہیں بلکہ خوش اسلوبی سے ماں کو سمجھا دینا چاہئے، مثلاً جہیز لینے کا مطالبہ کرے، بلا وجہ بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرے تو ایسی باتوں کا ماننا جائز نہیں۔

اگر زندگی میں اولاد کا انتقال ہو جائے تو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد یا حادثاتی موت کی صورت میں سرکار سے ملنے والی امداد میں ماں کا بھی حصہ ہوگا۔ اگر مرنے والے کے بال بچے ہیں تو چھٹا حصہ اور اگر بال بچے نہیں ہیں لیکن بھائی ہیں تو بھی چھٹا حصہ ملے گا اور مرنے والے کے بچے بھی نہ ہوں اور بھائی بھی نہ ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ ہوگا۔

ان وضاحتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عائلی زندگی میں عورتوں کے حقوق کی کس درجہ رعایت کی ہے کہ ایک طرف ان کو تمام مالی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے اور دوسری طرف خود ان کی مالی ذمہ داریاں باپ، شوہر، بیٹے اور بھائی کے ذمہ رکھی گئی ہیں اور ان رعایتوں کے ساتھ ساتھ ان کو قریب قریب ان تمام رشتہ داروں کا وارث بھی بنایا گیا ہے جن سے مردوں کو میراث ملتی ہے اور مہر کی ایک خطیر رقم بھی شوہر سے دلائی گئی ہے، مغربی معاشرہ کی طرح عورتوں کو کمانے اور ملازمت کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کی لطافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو گھر کی ملکہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ افسوس کہ بعض حقیقت ناآشنا لوگ عورتوں کے لئے اس کو قید سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ قید نہیں، بلکہ ان کا تحفظ ہے اور مردوں کو "قوام" (النساء: ۳۴) قرار دیئے جانے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ خاندان کی ضروریات کا ذمہ دار اور اس کا محافظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین میں عدل بھی ہے، انصاف بھی ہے، اعتدال بھی ہے اور توازن بھی اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی اور مرد و عورت کی صلاحیت کی پوری پوری رعایت بھی۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی اس سے انحراف اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، وہاں عدل و انصاف کے تقاضے مجروح ہوئے، خاندان بکھر گئے اور عورتوں کو آزادی کے نام پر سربازار رسوا کرنے کا اور سامان لذت و ہوس بنانے کی ایک مکارانہ تدبیر کی گئی ہے۔

"إن الدين عند الله الإسلام"

(۱۵ مارچ ۱۹۹۹ء)

کم عمری کی شادی

آج کل پریس کو مسلمانوں کے تعلق سے ہمیشہ کسی نئے مسئلہ کی تلاش رہتی ہے، جس کو بغیر کسی مناسب تحقیق اور جانکاری کے خوب پھیلایا جاتا ہے، علاوہ ازیں اٹھائے جانے والے مسائل میں ایک شادی کی عمر کا مسئلہ ہے، ہندوستان میں طویل عرصے سے یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے، برطانوی عہد میں ۱۹۲۹ء میں شاردا ایکٹ بنا، جس کے خلاف پورے ملک میں مسلمانوں نے آواز اٹھائی، اور جمعیۃ علماء دیوبند کے زیر اہتمام ”تحفظ ناموس شریعت“ کے نام سے ملک گیر تحریک چلائی گئی۔

آزادی کے بعد مختلف ریاستوں نے اس طرح کے قوانین بنائے ہیں، جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نکاح کی کم سے کم عمر ۱۸ سال مقرر کی گئی ہے، اس وقت اسی نوعیت کا ایک مقدمہ سپریم کورٹ میں چل رہا ہے، جس میں ۱۵ سال کی عمر میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی ہے، یہ مسئلہ چوں کہ مسلم پرسنل لا سے بھی متعلق ہے، اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس میں فریق بننے کی درخواست کی ہے۔

جو لوگ شادی کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کرنا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ کم عمری کی شادی لڑکیوں کی صحت کے لئے نقصان دہ ہے، کیوں کہ جسمانی نشو ونما کی تکمیل اور تولیدی کی مناسب صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کو ماں بننا پڑتا ہے، جس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑتا ہے، اس سلسلہ میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ جسمانی نشو ونما تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں طور پر نہیں ہوتا، موسمی حالات، غذا، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، اور جسمانی قوی اور تولیدی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے، نیز یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸ سال سے کم عمر

کی ہر لڑکی کے لئے ماں بننا نقصان دہ ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸ رسال کے بعد لڑکیوں میں لازمی طور پر ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ماں بننا ان کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ ہو، اس لئے ۱۸ رسال ہی کی تعیین قابل فہم نہیں، قانون فطرت کے تحت عورت کی اس صلاحیت کا اصل معیار وہی ہے کہ جب وہ بالغ ہو جاتی ہے تو اس میں بنیادی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس وقت ٹی وی کے فروغ، فحش رسائل کی کثرت، انٹرنیٹ اور بیہودہ فلموں کے ویڈیو، اور ان فلموں تک کم عمر لڑکوں کی رسائی کی وجہ سے صورت حال یہ ہے کہ نابالغ بچے تک جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو رہے ہیں، شادی سے پہلے ناجائز استقرار حمل کی کثرت ہو گئی ہے، سوال یہ ہے کہ کم عمری کا نکاح زیادہ نقصان دہ ہے یا کم عمری کے جنسی تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے، تو اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کر دینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انہیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے؟ تاکہ وہ اپنے بچوں کو فساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے سے بچا سکیں، اصل مسئلہ Child Marraige کا نہیں، بلکہ Child sex کا ہے، حکومت کو اور سماجی تنظیموں کو چاہئے کہ یہ جو بے راہ روی کا طوفان ملک میں آرہا ہے، اور ہماری تعلیم گاہوں کو اپنا ہدف بنا رہا ہے، پہلے اس کے سد باب کی کوشش کریں۔

تیسری بات یہ ہے کہ کم سنی کے نکاح کے واقعات اب خود ہی کم ہوتے جا رہے ہیں، چودہ پندرہ سال کی عمر میں تو لڑکے اور لڑکیاں میٹرک کرتے ہیں، اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے، اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی، لڑکوں کے لئے تو تعلیم کے بعد حصول روزگار کا بھی مسئلہ ہے، اس لئے اس تلاش روزگار میں کئی سال نکل جاتے ہیں، اور اس کے بعد ہی لڑکے شادی کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح قانون میں جو عمر متعین کی گئی ہے، عام طور پر اس سے

کہیں زیادہ عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی خود بخود کم سنی میں نکاح کا رجحان کم ہوتا جائے گا، اور جب تک تعلیم عام نہ ہو، محض قانون کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ کم سنی کی شادی کے واقعات شہر میں بہت کم پیش آتے ہیں، زیادہ تر دور دراز دیہاتوں میں اس طرح کا رواج پایا جاتا ہے، اور اس کی نوبت بہت کم آتی ہے کہ وہ معاملات عدالت کے سامنے آئیں اس لئے وہ قانون کے دائرہ سے باہر ہی رہتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے فریق بننے کی وجہ سے اسے مسلم مسئلہ کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے، حالاں کہ کم سنی کی شادی کے واقعات مسلمانوں میں بہت کم ہیں، خود ہندوؤں میں ان سے کہیں زیادہ ہے۔ راجستھان میں اب بھی اکھا تیج کے موقع پر ہزاروں شیرخوار بچیوں کی شادی کر دی جاتی ہے، راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش اور ہریانہ وغیرہ کے بعض علاقوں میں ہندو سماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کا تناسب مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، اصل مسئلہ ان روایات کو روکنا ہے، بالخصوص اس پس منظر میں کہ ہندو معاشرہ میں نکاح کے معاملہ میں لڑکی کی رضامندی اور ناراضگی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے، اور ان پر رشتے تھوپ دیئے جاتے ہیں، خاص کر کم عمری میں کئے گئے نکاح میں، ظاہر ہے کہ اس میں عاقدین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، اسلام میں اکثر حالات میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے، اور وہ اس نکاح کو رد کر سکتا ہے۔

ہندو معاشرہ میں نکاح کے سلسلہ میں اور بھی قابل اصلاح رسوم ہیں۔ آج بھی ستی کے واقعات سننے کو ملتے ہیں، آج بھی ہزاروں خواتین بھگوان کی مورتیوں سے بیاہ دی جاتی ہیں، اور بھگوان کی آڑ میں سنت اور مہنت ان کو اپنی ہوس کا سامان بنائے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض قبائل اور علاقوں میں چند شوہری کے واقعات بھی ملتے ہیں، اصل میں ایسی سماجی برائیوں کی اصلاح کی طرف ذرائع ابلاغ کو متوجہ ہونا چاہئے کہ یہ زیادہ قابل اصلاح ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں اعتدالی نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں کم سنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، مسلم معاشرہ میں ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ہی ان کا نکاح کیا جاتا ہے، خود قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ یتیموں کو آزماؤ، جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں، اور تم ان سے ہوشمندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو: وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (النساء: ۶) نکاح کو پہنچنے سے مراد بالغ ہونا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں: هو بلوغ حال النكاح من الاحتلام (احکام القرآن ۲/۳۶۳) اور مشہور مفسر علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: أي صاروا أهلاً له بالاحتلام (جلالین) یعنی نکاح کو پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ وہ احتلام کی وجہ سے نکاح کا اہل ہو جائے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں، پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عطا کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے، کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد ہی وہ اس اختیار کو استعمال کرنے کے قابل ہوں گے، اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ علماء نے بالغ ہونے سے پہلے بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے، اور مختلف صحابہ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں، حضرت قدامہ بن مظعونؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عروہ بن زبیرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ سے نابالغی کی عمر میں بچوں اور بچیوں کا نکاح کرنا یا نابالغی کے نکاح کے جائز ہونے کی صراحت منقول ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تو وہ نابالغ تھیں، اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چچا زاد بہن حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کا نکاح

ایسی صورت میں یقیناً مصلحت یہی ہے کہ اس وقت اس کا نکاح کر دیا جائے کہ اس میں اس کے لیے کوئی سر پرست کے لئے سہولت قریب بھی ہے اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی امید بھی۔

یقیناً یہ مصلحتیں ایسی نہیں ہیں جنہیں نظر انداز کر دیا جائے، اس لئے قانون ایسا بنانا چاہئے جس میں مفادات کو حاصل بھی کیا جائے اور نقصانات سے حفاظت بھی ہو، یہ بات جا سکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نابالغی کے نکاح سے بچا جائے، اگر باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء نکاح کریں یا باپ دادا ہی نکاح کریں، لیکن وہ اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کے اہل نہ ہوں، تو بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نکاح کے باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار دیا جائے، یہ حد درجہ توازن کی اسلام میں پہلے سے رعایت ہے۔ اگر ملحوظ ہو تو اس میں کم سنی کے نکاح کی مضرتوں سے بچا بھی جا سکتا ہے، اور اس کی مصلحتیں حاصل بھی کی جا سکتی ہیں۔ یہی اعتدال اسلام کا اصل امتیاز اور اس کی شناخت ہے۔

(۲۰؍ ستمبر ۲۰۰۲ء)

تعدد ازدواج کا مسئلہ

ابھی چند دنوں پہلے اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ ایک خاتون نے سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا کے تحت تعدد ازدواج کی اجازت کے خلاف اپیل دائر کیا ہے، تعدد ازدواج کا مسئلہ ان سماجی مسائل میں سے ہے جو آزادیٔ نسواں کی تحریک کے بعد سے پوری دنیا میں زیر بحث رہا ہے، اور اسلام کے معاشرتی قوانین کے خلاف اہل مغرب کی طرف سے جو فرد جرم عائد کی جاتی رہی ہے ان میں یہ مسئلہ سرفہرست ہے، انسان کی ایک فطری کمزوری یہ ہے وہ جس بات کو بار بار اور مختلف زبانوں سے سنتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط بات ہو اس کو درست سمجھنے لگتا ہے، چنانچہ تعدد ازدواج کے مسئلہ پر مغربی دنیا نے اتنا لکھا اور کہا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اس سلسلہ میں شک و تذبذب میں مبتلا ہیں، اور جن لوگوں نے مغربی ماحول میں یا مغربی نظام کے تحت تعلیم حاصل کی ہے وہ بے چارے تو اس مسئلہ پر ایسے شرمسار ہو جاتے ہیں کہ شاید عرق ندامت پیشانی سے گذر کر پاؤں کو جاتا ہو اس لئے اس مسئلہ پر پوری حقیقت پسندی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے!

تعدد ازدواج کا مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابل غور ہے، مذہبی، سماجی اور اخلاقی۔ مذہبی اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا گیا ہے، ڈاکٹر [illegible] رام نے رگ وید ([illegible]) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرد کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ شادیاں کرنا درست ہے اور بیویوں کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے، یہودی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی گنجائش ہے، چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں، ایک حضرت صفورہ، جو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں (خروج: ۲:۲۱) آپ کا دوسرا نکاح ایک کوشی خاتون سے ہوا تھا (گنتی ۱:۱۲) خود بائبل میں حضرت

داؤد علیہ السلام کی چند بیویاں (۲ شموئیل ۳) اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ۷۰۰ بیویوں کا ذکر آیا ہے (۱ سلاطین ۱۱) عیسائی مذہب چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے تورات ہی کی شریعت پر ہے اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اصلاً عیسائی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی اجازت ہے، چنانچہ شیخ محمود عقاد نے لکھا ہے کہ سترہویں صدی تک خود اہل کلیسا نے تعدد ازدواج کی حمایت کی ہے، فرماتے ہیں:

> مختلف انسانی نظام ازدواج کی تاریخ کو مستند عالم وسٹر مارک (Vister marc) نے بیان کیا ہے کہ کلیسا اور حکومت دونوں ہی سترہویں صدی کے نصف تک تعدد ازدواج کو مباح قرار دیتے تھے اور ان کے یہاں بکثرت اس کا رواج تھا۔ (المرأۃ فی القرآن ص ۵۳)

غرض دنیا کے مشہور مذاہب میں شاید ہی کوئی مذہب ہو جس نے تعدد ازدواج کو ناجائز رکھا ہو، اسلام نے بھی تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے لیکن اس کے لئے بنیادی طور پر دو باتوں کی تحدید کی ہے، اول یہ کہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار تک ہی تعدد ازدواج کی اجازت ہے، دوسرے یہ اجازت عدل کے ساتھ مشروط ہے، یعنی جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان حقوق کی ادائیگی اور سلوک و برتاؤ میں برابری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہے، یوں اسلام نے ایک طرف سماجی ضرورت کی رعایت بھی کی ہے اور دوسری طرف ان حدود و قیود کے ذریعہ اس اجازت کو غلط استعمال سے بچانے کی کوشش بھی کی ہے۔

دوسرا پہلو تعدد ازدواج میں سماجی ضرورت کا ہے، عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا، لیکن شرح اموات میں مردوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، کیوں کہ بہت سے حادثات میں مردوں کی جانیں کام آتی ہیں، مثلاً پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی، اس میں اسی لاکھ فوجی مارے گئے، شہریوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ فوجی مرد تھے، دوسری جنگ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی، جس میں کل ساڑھے چھ کروڑ آدمی یا تو ہلاک ہو گئے یا معذور، ان میں بیشتر مرد تھے اور معذورین

میں غالب ترین اکثریت مردوں کی تھی، اس جنگ عظیم میں برباد ہونے والا قائد ملک جرمنی تھا، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک جرمنی میں یہ کیفیت تھی کہ ہر مرد کے مقابلہ شادی کی عمر کو پہونچی ہوئی تین عورتیں ہوتی تھیں، فرانس میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ تیس ہزار سات سو سے زیادہ تھی، اور آسٹریا میں ۱۸۹۰ء میں چھ لاکھ، چوالیس ہزار سات سو چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں، عراق ایران جنگ (۱۹۷۹ء-۱۹۸۸ء) میں عراق کی ایک لاکھ اور ایران کی بیاسی ہزار عورتیں بیوہ ہو گئیں۔

جنگوں کے علاوہ جو دوسرے تخریبی یا تشددی حادثات پیش آتے ہیں اور جو لوگ غنڈہ گردی کا نشانہ بنتے ہیں وہ بھی عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں، پھر اگر جیلوں میں طویل المدت قیدیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں نوے سے زیادہ تعداد مردوں کی ہوتی ہے، کیوں کہ طویل قید بھیانک جرائم پر ہوتی ہے، اور اپنی نفسیاتی کمزوری کی بناء پر مجرم ذہن کی عورتیں بھی بھیانک قسم کے جرائم کا حوصلہ نہیں پاتیں، ان اسباب کی بناء پر عام طور پر ایک مرد کے مقابلہ ایک سے زیادہ عورتوں کا تناسب پایا جاتا ہے، امریکہ جیسے ملک میں جس میں حادثات سے حفاظت کا زیادہ ترقی یافتہ نظام قائم ہے، اور وہ ٹیکنالوجی میں ترقی اور بالادستی کی وجہ سے حریف ملکوں کے مقابلہ اس کی فوجیوں کی ہلاکت کا تناسب بہت کم ہوتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۷ء میں وہاں عورتوں کی آبادی بمقابلہ مردوں کے تقریباً اسی لاکھ زیادہ تھی۔

ان حالات میں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد تجرد اور محرومی کی زندگی گذارے، اس لئے تعدد ازدواج مردوں کی ہوس اور نفسانی طمع کی تکمیل نہیں، بلکہ ایک سماجی ضرورت ہے۔

تعدد ازدواج کے مسئلہ میں سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، عفت وعصمت انسانیت کا بنیادی جوہر ہے، گائے اور بیل، گھوڑے، گدھے اور ان کی مادہ کے درمیان کیا کبھی نکاح ہوا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے، نر و مادہ کی تقسیم اور جنسی خواہش انسان

میں بھی ہے اور دوسرے حیوانات میں بھی۔ لیکن یہ انسانی ذات کا امتیاز ہے کہ نکاح کے ذریعے ایک مرد اور عورت رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں، اور ان کی وفاداریاں ایک دوسرے کے لئے محدود و مخصوص ہو جاتی ہیں، دوسری مخلوق اس وفاداری سے نا آشنا ہے۔ اسی وفاداری کا نام "عفت و عصمت" ہے۔ عفت و عصمت انسان کی فطرت میں ہے اور ہر سلیم الفطرت شخص اس کا ادراک کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے بارے میں برائی کی نسبت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تعدد ازدواج اس جوہر عفت کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دنیا کی تاریخ میں جب کبھی بھی قانونی تعدد ازدواج پر روک لگائی گئی ہے وہاں غیر قانونی تعدد ازدواج نے ضرور راہ پائی ہے۔ قدیم تہذیبوں میں یونانی اور رومی تہذیب تعدد ازدواج کی مخالف تھی۔ ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (۱۸۳۸ء۔ ۱۹۰۳ء) نے یونانی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے کہ مرد کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ تھی لیکن غیر قانونی داشتاؤں پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

(تاریخ اخلاق یورپ ص ۲۳۳، ترجمہ دریابادی)

چنانچہ منصف مزاج غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، عرب تمدن کے معروف مصنف ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

> مغرب میں بھی ۔۔۔ ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں ہی میں ہے، اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کس امر میں مغربیوں کے ناجائز تعدد ازدواج سے کمتر سمجھا جاتا ہے، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اول الذکر ہر طرح دوسرے پر ترجیح رکھتا ہے۔ (تمدن عرب ص ۳۹۹)

جناب مالک رام، علم کے حقیقت پسند اصحاب دانش میں تھے ان کا یہ اقتباس پڑھنے کے لائق ہے۔

تعدد ازدواج کی تائید میں متعدد دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں، مثلاً

یہ کہ عام حالات میں دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر ایک مرد، ایک عورت کے اصول پر عمل کیا جائے تو ان زائد عورتوں کا کیا بنے گا؟ کیا ہم ان پر نکاح کا راستہ بند کر کے ان کی اور ان کے ساتھ شادی شدہ مردوں کی بھی گمراہی کا سامان تو پیدا نہیں کر رہے ہیں؟ اگر آپ ان عورتوں کو نکاح کرنے کا موقع نہیں دیتے تو گویا انہیں قعر ذلت میں دھکیل رہے ہیں اور انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کریں، کیوں کہ یہ جذبہ فطری ہے، اگر عورت نکاح کی اجازت سے اس کی تسکین نہیں کر سکے گی تو اس کو دھتا بتائے گی اور گھٹ گھٹ کر رات میں شکار کھیلے گی اس صورت میں آپ کو کسی اور حرام اولاد کا وجود قانونا تسلیم کرنا پڑے گا، حق انتخاب آپ کو حاصل ہے، ایک طرف آپ اس عورت کو قانونی عزت بیوی اور گھر کی مالک اور محترم ماں بنانے پر قادر ہیں، دوسری صورت میں وہ قابل نفرت داشتہ یا کسی خاندان برباد اور اپنے اور تمام سماج کے لئے کلنک کا ٹیکا بننے پر مجبور ہے۔ (اسلامیات:۱۳۴،۱۳۵)

پس حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی گنجائش ایک مخصوص دائرے میں انسانی سماج کے لئے ضرورت کے درجہ میں ہے، اور یہ کوئی نظری فلسفہ نہیں، بلکہ مغرب کا معصیت باختہ سماج اس کی عملی مثال ہے۔

تعدد ازدواج میں ایک پہلو عورت کے مفاد و تحفظ کا بھی ہے، اگر ایک عورت دائم المریض ہو، صاحب اولاد نہ ہو، کسی مناسب یا نامناسب وجہ سے مرد دوسرے نکاح پر مصر ہو تو اگر تعدد ازدواج کی گنجائش نہ رکھی جائے تو یا تو وہ اسے طلاق دے دے گا، جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے یا وہ غیر قانونی تعدد ازدواج کا راستہ اختیار کرے گا، اور غیر قانونی بیوی قانونی بیوی سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے، کیوں کہ وہ مرد کو زیادہ بلیک میل کر سکتی ہے، اور اپنے تجربات سے قانونی بیوی کو حاصل کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، ایسی صورتوں میں تعدد ازدواج رحمت ثابت ہوتی ہے کہ زحمت، مطلقہ اور بیوہ خواتین کے مسائل کا حل اکثر یہی

طلاق، اسلامی نقطۂ نظر

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، مقدس اور پائیدار رشتہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ جس وقت مرد و عورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے، وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں کی وجہ سے اس رشتہ کی مضبوط بنیادوں کو نہ ہلا دیں۔

قرآن مجید نے میاں بیوی کے رشتہ کو ایک دوسرے کے لئے وجہ سکون بتایا ہے (روم ۲۱) اور ایک کو دوسرے کے لئے لباس قرار دیا ہے کہ جس طرح لباس انسانی جسم کا سب سے بڑا رازدار، تکلیف و آرام کا ساتھی اور محافظ ہے، اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے رازدار، ان کی باہمی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے والے اور ہر حال میں ان کے ساتھی اور رفیق ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں اس رشتہ کو بڑی عظمت حاصل ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے مرد و عورت میں عفت اور پاکدامنی پیدا ہوتی ہے، دو اجنبی خاندان ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور ان کے درمیان محبت و وابستگی پیدا ہو جاتی ہے، یہ تعلق نسل انسانی کی افزائش کا ذریعہ بنتا ہے۔

پھر اگر خدانخواستہ رشتہ ٹوٹتا تو اپنے ساتھ ڈھیر ساری مضرتیں لاتا ہے، دو آدمی کی زندگیاں ویران ہو جاتی ہیں، بال بچوں کو ماں باپ کی شفقت یا ان کی محبت میں سے کسی ایک سے محروم ہونا پڑتا ہے، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت صحیح طور پر نہیں ہوتی، دو خاندان جس قدر ایک دوسرے سے قریب ہوئے تھے اب اتنی ہی دور ہو جاتے ہیں اور آپس میں سخت نفرت اور کدورت پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اسلام ابتداء ہی میں ایسے تمام دروازوں کو بند

کر دیتا ہے جو بعد میں باہمی نفرت، اختلاف اور ایک دوسرے سے دوری اور علیحدگی کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس کے لیے اسلام نے بعض ایسی چیزوں کا بھی لحاظ کیا ہے جو اسلام کی اصل سے میل نہیں کھاتیں، مثلاً پردہ کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے، وہ سب پر واضح ہے، لیکن منگیتر کو دیکھنے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دی گئی ہے بلکہ اسے بہتر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ شہوت اور بدنگاہی کا اندیشہ ہو تو بھی مرد ایسی لڑکی کو دیکھ سکتا ہے جس سے نکاح کا ارادہ ہو (عالمگیری ۵/۳۷۷، کتاب الکراہیہ) اسی طرح باوجود اس کے کہ اسلام انسانی مساوات اور برابری کا قائل ہے اور ان کے نزدیک فضیلت اور برتری اور کمتری صرف تقویٰ اور اللہ کا خوف ہے، لیکن چوں کہ بسا اوقات خاندانی اور معاشی یا پیشہ ورانہ برتری اور کمتری میاں بیوی کے درمیان کھچاؤ اور نفرت کی بنیاد بن جاتا ہے، اس لئے شریعت نے اس کی بھی اجازت دی کہ نکاح کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے۔

طلاق چوں کہ اس رشتہ کو توڑنے کا نام ہے، اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر دی جائے۔ (صحیح مسلم) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت حرام ہے۔ (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ) آپ ﷺ نے نکاح کا حکم فرمایا اور طلاق سے منع فرمایا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مزہ چکھنے والے عورت یا مرد کی لذت اٹھا کر پھر اس سے جدائی اختیار کرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔ (ان اللہ لا یحب الذواقین و الذواقات)

مگر کبھی کبھی طلاق اور میاں بیوی کی جدائی ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے، کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ان دونوں کا ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور کچھ ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا اور علاحدہ رہ کر زندگی بسر کرنے ہی میں دونوں کے لئے سکون و چین اور اطمینان رہتا ہے۔ ان حالات میں شریعت ایک ناپسندیدہ ضرورت سمجھ کر اس کی اجازت دے دیتی ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جن

چیزوں کی اجازت دی ہے ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قابل نفرت چیز طلاق ہے «ابغض الحلال عند اللہ الطلاق» (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور فقہاء نے بھی اسے بلاضرورت: جائز اور ممنوع قرار دیا ہے۔ (رد المحتار ۲/۵۷۱)

چند صدی قبل تک اسلام پر اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس نے جدائی کی اجازت دے کر ظلم کیا ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندو مت اور عیسائیت میں اس کی مطلق اجازت نہ تھی (عیسائیوں کے یہاں اس قانون کی بنیاد حضرت مسیح کا یہ ارشاد تھا: جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے) (متی ۱۹:۶) حالانکہ اس حکم کی حیثیت بالکل اخلاقی تھی، جیسا کہ اس سے قریب تر حکم قرآن مجید نے بھی دیا ہے۔ (بقرۃ:۲۳۷)

مگر یہ ایک ناقابل عمل اور غیر فطری بات تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس قانون میں تبدیلی پیدا کرنی پڑی اور آج ہندوستان میں ہندو قانون اور تمام عیسائی ممالک کے عیسائی قانون میں طلاق کی گنجائش پیدا کر لی گئی ہے۔

سب سے پہلے وعظ و نصیحت اور سمجھانے سے کام لیا جائے، اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے نتیجہ اظہار کے لیے اپنی خواب گاہ اور بستر علیحدہ کرلو یعنی وقتی طور پر اس سے مباشرت کرنا چھوڑ دو، پھر اگر یہ کر کے بھی عورت کی اصلاح نہ کر سکو تو مناسب حدوں میں اس کی کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی مار پیٹ بھی کر سکتے ہو، اب اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو بہتر رفیق زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو۔ ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاح نہ ہو سکے اور عورت بدزبانی اور زیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دور کرنے سے قاصر ہیں، لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے۔

"اگر ان دونوں میں شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ایک پنچ (حکم) کو بھیجو، اگر یہ دونوں واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔ (النساء:۳۵)

یعنی دوسرے سمجھدار، دیندار اور ہمدرد افراد کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کی

جائے گی۔ اگر اس طرح آپس کی خلش دور ہو جائے تو دونوں میاں بیوی کی طرح زندگی بسر کریں گے، لیکن اگر عاقل اور بچوں کی کوشش کے باوجود دونوں میں موافقت نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے متنفر ہوں اور عورت کی طرف سے نامناسب حد تک مسلسل عدول حکمی اور نافرمانی ہو رہی ہو تو اب شریعت طلاق کی اجازت دیتی ہے۔ پھر اب بھی ایک ہی دفعہ تین طلاقیں نہ دے، بلکہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ پاکی کی حالت میں (جس میں بیوی سے مباشرت نہ کی ہو) لفظ "طلاق" کے ذریعہ صرف ایک طلاق دی جائے۔ اس طلاق کے بعد اس کو یہ حق رہے گا کہ عدت گذرنے سے پہلے پہلے تک اگر اپنے فیصلہ پر پشیمانی یا عورت کی طرف سے ندامت کا اظہار اور بہتر زندگی کا وعدہ ہو تو بیوی کو لوٹا لے اور اگر وہ علیحدگی کے فیصلہ پر اٹل ہو تو یوں ہی چھوڑ دے، عدت گذرنے کے بعد خود بخود یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔

عورتیں بھی طلاق کے واقعات کم کرنے میں بڑا اہم اور موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان کو چاہئے کہ مختلف طریقوں سے شوہر کو اپنی طرف راغب اور مائل رکھیں اور کوئی ایسی بات پیش نہ آنے دیں جو باہمی نفرت اور آپس کی اختلاف کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ پوری طرح شوہر کی مزاج شناس ہوں، وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اس بات کا اندازہ لگاتی رہیں کہ وہ کس بات اور کس عمل سے خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناخوش؟

پھر اگر کبھی ناراض ہو جائے تو اس کی کیا مرغوب چیز ہے، جس کا سہارا لے کر اس کو خوش کیا جا سکتا ہے؟ کس بات اور کس ضرورت کے اظہار کے لئے کیا مناسب وقت ہے؟ جن خواتین نے اس رمز کو جان لیا اور اپنی ازدواجی زندگی میں اس کا خیال رکھا ان کی زندگی ہمیشہ خوش رہے گی اور ان شاء اللہ طلاق کی نوبت نہ آئے گی۔

یہ تو ایک اصولی بات ہے، اس کے علاوہ چند عمومی باتوں کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے۔

اول یہ کہ مرد جب تھک کر اپنے کام سے واپس آئے، اس وقت پوری خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے اور فوراً اپنی کوئی ایسی ضرورت نہ پیش کر دے جو مرد کے لیے

پریشانی کا باعث ہو۔ حدیث میں نیک بیوی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ شوہر کو خوش کر دے، عورت اس حدیث کا مصداق اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس پر عمل کرے۔

دوسرے یہ کہ مرد کے لئے اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھے اور پوری طرح زیبائش و آرائش کرے، شریعت دوسروں کے لئے زیبائش و آرائش کی اجازت نہیں دیتی، جب کہ شوہر کے لئے اس کو پسند کرتی ہے، اس کی وجہ سے شوہر عفیف و پاک دامن رہتا ہے، بدنگاہی سے بچتا ہے اور دوسری عورتوں کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔

تیسرے اس بات کا خیال رکھے کہ ایسے مردوں سے اجتناب برتے جو شوہر کو ناپسند ہوں، غیر محرم سے یوں بھی شریعت پردہ کا حکم دیتی ہے، لیکن خصوصاً ان لوگوں سے جائز حدوں میں بھی ربط نہیں رکھنا چاہئے جو شوہروں کو ناپسند ہوں، اس معاملہ میں مرد کی طبیعت فطری طور پر بہت حساس واقع ہوئی ہے۔

چوتھے شوہر سے اپنی ضروریات کے مطالبہ میں ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے خود غرضی کا اظہار ہوتا ہو، یا ایسا محسوس ہوتا ہو گویا وہ شوہر کی حریف ہے، مثلاً شوہر کے پاس کپڑے ہوں یا نہ ہوں اپنے لئے کپڑوں کا مطالبہ یا اگر شوہر کپڑا لائے تو اس کا مقابلہ، بلکہ زیادہ سے زیادہ قناعت اور کفایت شعاری کی راہ اختیار کرے اور اپنے مقابلہ میں شوہر اور دوسرے اہل خانہ کی ضرورت کو مقدم رکھے۔ اسی طرح جب وہ شوہر کے دل میں اپنا گھر بنا لے گی تو خود بخود مرد اس سے زیادہ کرے گا جو وہ چاہتی ہے۔

ان کے علاوہ کھانے اور پکوان میں ایسا تنوع کہ مرد کا رجحان ہوٹلوں کی طرف نہ رہے، نیز اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کے پاس شوہر کی شکایت نہ کرے، بلکہ اگر باہمی رنجش اور کبیدگی پیدا ہو گئی تو اپنے ہی حد تک اس کو محدود رکھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے سماج میں ازدواجی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کریں اور یہ بتائیں کہ طلاق کب اور کس طرح دینی چاہئے۔

(۱۴/ مئی ۱۹۹۹ء)

سے کسی ایک وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت، حبس، ملکیت، ماں باپ، بال بچے، بھائی بہن، دادا دادی، اور بعض حالات میں دوسرے اعزہ و رشتہ داروں کا نفقہ قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت کی بنا پر نفقہ واجب قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں دو اصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ایک یہ کہ قرابت کی بناء پر اس شخص کا نفقہ واجب ہوگا جو خود اپنی کفالت سے قاصر ہو، دوسرے اس شخص پر واجب ہوگا جو اتنا خوش حال ہو کہ اپنی ضروریات پوری کرکے اس شخص کی کفالت بھی کرسکتا ہو۔

ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہو، اس کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، جب غلام اور باندی کا وجود تھا تو اسی بنیاد پر مالک پر غلام اور باندی کا نفقہ واجب قرار دیا جاتا تھا، اسی طرح اسلام جانوروں کا نفقہ ان کے مالک پر واجب قرار دیتا ہے، اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کا چارہ فراہم نہ کرسکے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر حلال جانور ہو تو یا تو ذبح کرکے کھالے یا فروخت کردے، اور حرام جانور ہو تو اسے بہر حال فروخت کردے، اس کو بھوکا رکھ کر یوں ہی اپنی ملکیت میں رکھنا جائز نہیں، اور یہ بات اخلاق کے خلاف ہے۔

"حبس" کے معنی ہیں روکے رکھنا، یعنی اگر ایک شخص دوسرے شخص کی وجہ سے محبوس ہو، پابندی کی حالت میں ہو اور معاشی سرگرمیاں اختیار نہیں کرسکتا ہو تو اس کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا جس کی وجہ سے وہ پابندی اور حبس کی حالت میں ہے، ملازمین اور مزدوروں کی تنخواہ گورنمنٹ اور آجرین پر کیوں واجب ہے؟ اسی لئے کہ وہ سرکار اور آجر کے لئے محبوس ہے — بیوی کا نفقہ شوہر پر اسی جہت سے واجب ہوتا ہے، بیوی گھر کی دیکھ بھال، بال بچوں کی پرورش اور امور خانہ داری کے لئے گویا محبوس ہوتی ہے، اس لئے شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب رکھا گیا ہے، حبس کی وجہ سے جو نفقہ واجب ہوتا ہے، اس کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ محبوس و پابند شخص غریب و تنگ دست ہو یا معاشی اعتبار سے خوش حال و خود مکتفی، اور اسی طرح وہ جس شخص کے لئے محبوس ہے، اس کی معاشی حالت اچھی ہو یا معمولی، بہر صورت نفقہ واجب ہوگا۔

جب ایک عورت اپنے شوہر سے مطلقہ ہو جاتی ہے، تو عدت گذرنے کے بعد وہ

پہلے شوہر کے لئے مجبور نہیں، وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے، اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاشی سرگرمی بھی اختیار کر سکتی ہے، اس لئے ''حبس'' کی وجہ سے نفقہ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد اپنے سابق شوہر سے اس کی کوئی قرابت باقی نہیں رہی، کیوں کہ ازدواجی رشتہ خونی اور انوٹ رشتہ نہیں، بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے جو زبان کے بول سے وجود میں آتا ہے اور زبان کے بول ہی سے ختم بھی ہو جاتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد میاں بیوی میں کوئی قرابت باقی نہیں رہتی — جہاں تک ملکیت کی بات ہے تو اسلام کی نگاہ میں شوہر و بیوی نکاح کے دو فریق اور زندگی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں نہ کہ مملوک، عورت کو بعض قوانین میں مرد کی ملکیت اور جائیداد تصور کیا جاتا تھا، اسلام نے اس تصور کو مٹایا، اور کہا کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے مردوں پر: ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف (البقرۃ: ۲۲۸) اس طرح اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طلاق اور عدت گذرنے کے بعد کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے مرد پر اس عورت کا نفقہ واجب قرار دیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ ہندو مذہب میں بنیادی تصور یہی ہے کہ بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی ہے، اور ایک عورت کو ہمیشہ ہی شوہر کے ساتھ بندھا رہنا ہے، وہ اپنے آپ کو اس کی قید نکاح سے آزاد نہیں کر سکتی، دراصل اسی تصور نے ''ستی'' کے رواج کو جنم دیا، کہ جب شوہر مر جائے تو عورت بھی اس کے ساتھ نذر آتش کر دی جائے، پھر چونکہ ہندو سماج میں عورت کے مطلقہ ہونے کا تصور نہیں، اس لئے مطلقہ سے متعلق احکام کا بھی وجود نہیں، اسی لئے برادران وطن کے لئے یہ بات حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ کوئی عورت جب ایک بار نکاح میں آچکی ہو تو پھر وہ نکاح کی وجہ سے واجب ہونے والے نفقہ سے کیوں کر محروم ہو سکتی ہے؟ لیکن اسلام میں نکاح کا جو اصل تصور ہے اور اس نے عورت کو جو مقام عطا کیا ہے، اس کے پس منظر میں جب دیکھا جائے تو یہ بالکل معقول بات ہے کہ جب مرد و عورت کے درمیان ازدواجی رشتہ ہی باقی نہیں رہا تو اس کا نفقہ کیوں کر واجب ہوگا؟

خالص عقلی اور سماجی مصالح کے نقطۂ نظر سے بھی مرد پر مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینا نامناسب بات ہے، اگر مرد کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے زندگی بھر نفقہ دیتے رہنا پڑے گا تو جو مرد اپنی بیوی سے نجات چاہتا ہو اس میں نفرت کے جذبات مزید بڑھیں گے، اس زندگی بھر کی سزا سے نجات پانے کے لئے وہ غیر قانونی راستے اختیار کرے گا، اور بجائے طلاق دینے کے بیوی کی زندگی کے درپے ہوگا، اور اس طرح کے واقعات پیش آئیں گے۔ جو روز ہمارے اخبارات کی سرخیاں بنتے ہیں، قانونی راستے کو اتنا مشکل، دشوار اور تکلیف دہ بنانا چاہئے کہ لوگ غیر قانونی راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

دوسرے بد قماش اور چالاک عورتیں کوشش کریں گی کہ شوہر کو اس طرح دق کریں کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اور پھر اپنی مفسدانہ حرکتوں میں مشغول رہیں گی، ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ ایک مطلقہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ علانیہ عدالت میں آتی ہیں اور سابق شوہر سے نفقہ وصول کر کے لے جاتی ہے، گویا مرد جرم بے گناہی کی سزا پا رہا ہے، اور عورت اپنی عیش کوشی کے لئے "وظیفۂ حسن خدمت" حاصل کر رہی ہے، کیا اسے سماجی انصاف کہا جا سکتا ہے؟ بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض بد قماش عورتیں سابق شوہر سے نفقہ حاصل کرنے اور آتش انتقام ٹھنڈی کرنے کی غرض سے دوسرے نکاح سے احتراز کریں، اور بے راہ روی کو ترجیح دیں ——

آخر ایک شخص کا نفقہ دوسرے پر واجب قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد و اساس تو ہونی چاہئے، اگر اجیر اور آجر کے درمیان اجارہ ختم ہونے کے بعد ایک پر دوسرے کی واجبات عائد نہیں ہوتے، ملازمت ختم ہونے کے بعد ملازم تنخواہ کا مستحق نہیں ہوتا تو یہ کون سی منطق ہے کہ ایک مرد و عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ باقی نہیں رہا، لیکن مرد نفقہ ادا کرتا رہے؟ —— اور پھر کیا کوئی غیرت مند شریف عورت اس بات کو گوارا کر سکتی ہے کہ ایک اجنبی اور بے تعلق شخص کے لقموں پر اس کی پرورش ہو، اور ایک ایسے شخص کے سہارے وہ زندگی گذارے جس نے اسے رد کر دیا ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ عقل اور سماجی

مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مطلقہ کا اس کے سابق شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن کیا اسلام نے ایسی عورتوں کو بے سہارا کر دیا ہے؟ ہرگز نہیں! اسلام کی نقطۂ نظر سے نکاح کی وجہ سے عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے منقطع نہیں ہوتا، اسی لئے وہ اپنے ماں باپ اور بعض اوقات بھائی اور بچا وغیرہ سے میراث کی حقدار ہوتی ہے، جب کوئی عورت مطلقہ ہو جائے تو اب اس کے والدین اور قریبی محرم رشتہ داروں پر حسب مراتب اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ اگر اس خاتون کا انتقال ہو جائے تو جو لوگ شرعاً اس کے وارث ہوں گے، ان ہی افراد پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، طلاق کے وقت مہر کی صورت میں اسے ایک خطیر رقم ملتی ہے، جسے وہ کاروبار میں شریک کرکے کچھ گذر اوقات حاصل کر سکتی ہے، اور اگر اس کی گود میں طلاق دینے والے شوہر کے بچے اور بچیاں ہیں تو بچوں کی عمر سات سال ہونے تک اور لڑکیوں کی عمر بالغ ہونے تک ماں پرورش کی حقدار ہے، اس عرصہ میں وہ سابق شوہر سے اس کے بچوں کی پرورش کرنے کی اجرت وصول کر سکتی ہے، یہ نفقہ نہیں ہے، بلکہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ اس لئے ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے ایسی عورت کو محروم اور بے آسرا رکھا ہو، اور سب سے بڑا آسرا یہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف دوسرے نکاح کی اجازت دی، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

لیکن قانون کے فوائد اور نقصانات کا تعلق بہت کچھ قانون پر عمل کرنے والوں کے صحیح اور غلط استعمال سے بھی ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطلقہ عورتوں کے نکاح کو رواج دیں، ہندو سماج کی طرح ایسی خواتین کو منحوس نہ سمجھیں، ہمارے مسئلہ کی اصل جڑ یہی ہے، عرب معاشرہ میں آج بھی مطلقہ کا کوئی مسئلہ نہیں، اور طلاق کے واقعہ کو چنداں دشوار نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ وہاں طلاق شدہ عورتوں کا نکاح کوئی دشوار بات نہیں، بلکہ عدت گذرتے گذرتے پیامات آنے شروع ہو جاتے ہیں، اسی لئے وہاں خاندانوں میں اس طرح کی تلخی بھی پیدا نہیں ہوتی، جو ہندوستان میں دیکھنے میں آتی ہے —— دوسرے ہماری محبت اور حسن سلوک کا دائرہ اتنا سمٹ گیا ہے کہ ہم "اپنے اور اپنے بچوں" کے سوا کسی کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، یہاں تک کہ بعض اوقات بوڑھے ماں باپ کو بھی بوجھ سمجھنے

سکتے ہیں، ان حالات میں مظلوم عورتوں سے کیسی ذمہ داریوں کی ادائیگی یا نبھانے کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ اس لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ مسلم سماج میں ایک تحریک چلائی جائے اور لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے کہ لڑکی بوجھ نہیں ہے اور عورتوں کی ضروریات کی کفالت بھی ہماری ذمہ داری ہے، اور یہ احسان نہیں، بلکہ ایک حق کی ادائیگی ہے۔

اگر ہم خود اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اپنے فرائض کو ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں تو قانون شریعت پر نہ کوئی زبان کھل سکتی ہے اور نہ کوئی انگلی اٹھ سکتی ہے!!

([illegible] شیخ)
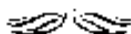
پردہ — حفاظت نہ کہ قید

حیرت کے کانوں سے سنئے اور یقین نہ آئے پھر بھی یقین کیجئے، کہ دنیا کے جغرافیہ میں مسلم ملک کے نام سے پائے جانے والے ایک ملک "جمہوریہ ترکی" نے ایک اسلام پسند خاتون رکن اسمبلی کو اسمبلی کی رکنیت بلکہ ملک کی شہریت سے بھی محروم کر دیا ہے، شاید آپ سمجھیں کہ اس خاتون نے کوئی اخلاقی جرم کیا ہوگا، کسی مالی بدعنوانی کی مرتکب ہوئی ہوگی۔ بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات اس سے صادر ہوئی ہوگی، دین و مذہب اور اخلاقی اقدار کا مذاق اڑایا ہوگا؟ مگر نہیں، ایسا نہیں ہے، اس "گنہگار خاتون" نے ترکی کے سیکولرزم پر حملہ کیا ہے، اس کی سیکولر قدروں پر کلہاڑی چلائی ہے اور ایک ایسا کام کیا ہے جس نے ترکی کے "روشن خیال" اور ترقی پسند حکمرانوں کو شرم سے پانی پانی کر دیا ہے، اور ان کی جبینِ غیرت لرز کر رہ گئی ہے — اس خاتون رکن اسمبلی کا "جرم" یہ تھا کہ وہ اسکارف پہن کر اسمبلی میں آگئی تھی، اور اس کی نسوانی غیرت و حیا کو اس پر اصرار تھا، یہ اتنی بڑی غلطی تھی جو ترک حکومت کے لئے نہایت ناقابلِ برداشت اور شرمناک بات تھی۔

حالانکہ ترکی کا زیادہ تر حصہ ایشیائی علاقہ ہے، ایک چھوٹی سی ٹکڑی یورپ میں ہے، اس کے مغربی پڑوسیوں کا رویہ کبھی بھی اس کے ساتھ دوستانہ تو کیا منصفانہ بھی نہیں رہا، ترکی کی طرف سے یونان کی عداوت اور اس کو نیچا دکھانے کی کوشش کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، بوسنیا، کوسوو اور بلقان کے علاقوں میں مغربی بربریت اور انسانیت کشی کے جو واقعات پیش آتے ہیں، اس کی تہہ میں ترکوں سے تاریخی عداوت ہی کارفرما ہے، اس کے مغربی دوستوں کا حال یہ ہے کہ باوجود صد ہزار خوشامد کے آج تک اسے یورپین یونین میں داخلہ نہیں مل سکا۔ اور یورپ کی تجارتی منڈی میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتا

جاتا ہے۔ یہ مغربی ممالک ہی ہیں جو کردوں کو ترکوں کے خلاف اور ترکوں کو کردوں کے خلاف اکساتے رہتے ہیں، تاکہ سیاسی عدم استحکام برقرار رہے۔ دوسری طرف ترکی کی سربلندی اور فتحمندی کی تاریخ دیکھئے، یہ عالم اسلام ہی ہے جس نے ترکی کو صدیوں خلافت کا تاج گہر بار پہنایا، اور اس طرح ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بہت بڑے حصہ پر بلا شرکت غیرے ترکوں نے حکومت کی۔ یہ ترک جن کا دنیا کی قیادت میں کوئی کردار نہیں تھا، اور تہذیب وثقافت کا بھی اس قوم سے گذر نہیں ہوا تھا، اسلام کی بادِ نسیم نے اس کو ایک بہار آفریں انقلاب سے ہمکنار کیا، اور ترک تمام تر صلاحیت، عسکری قوت، علمی وفکری بلندی اور تمدن وثقافت کا ایک ایسا آفتاب بن کر مشرق ومغرب پر چھا گئے کہ کسی کورچشم کے لئے بھی اس سے انکار ممکن نہ تھا، لیکن اسلام کا منت کش ہونے کی بجائے اسلامی قدروں ہی سے بغاوت ترکوں کی بدبختی اور احسان فراموشی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ جس ملک نے صدیوں حرمین شریفین اور مسلمانوں کے قبلۂ اول کی حفاظت کا شرف حاصل کیا ہو، وہ آج اسرائیل کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرے اور فوجی مشقیں کرے، اس سے بڑھ کر عجوبہ اور کیا ہوگا؟

یہ سیکولرزم کا لفظ بھی "موم کی ناک" سے کم نہیں، جہاں چاہیں سیدھی کردیں، جہاں چاہیں ٹیڑھی کردیں، جب چاہیں پھیلا دیں اور جب چاہیں سمیٹ دیں۔ دنیا میں شاید ہی کسی لفظ سے اتنی متضاد حقیقتوں کو وابستہ کیا جاتا ہو، اور جتنا ظلم اس لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے شاید کسی اور لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہو، امریکہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب اور تہذیب پر چلنے کی آزادی ہے، خواہ وہ کسی قدر بھی خلاف عقل اور خلاف فطرت ہو، مرد برہنہ پھرنے لگے، اور عورتیں بے لباس ہوجائیں، تب بھی کوئی اعتراض نہیں، برطانیہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہے، لیکن اگر کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہانت کرے تو قانونی جرم، اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ بے احترامی کی جائے تو کوئی مواخذہ نہیں، خود ہمارے ملک میں ہر سیاسی جماعت کے پاس سیکولرزم کا اپنا تصور ہے، یہاں تک کہ مسجدوں کو شہید اور عیسائی مبلغین کو زندہ نذرِ آتش کرنے والے بھی

اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں، گویا سیکولرزم ایسی تختۂ مشق ہے کہ اس پر جتنے بھی وار کرو، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ترکوں کا سیکولرزم شاید سب سے زیادہ "روشن خیالی" پر مبنی ہے، کیونکہ فرانس جس کو جمہوری انقلاب کا مؤسس کہا جاتا ہے، اور جو دنیا کی بڑی طاقتوں میں ایک ہے، اس کے سیکولرزم میں تو پردہ اور نقاب سے کوئی رخنہ نہیں پڑتا، لیکن ترکوں کا سیکولرزم اس سے مرگ بہ لب ہو جاتا ہے۔ سیکولرزم تو اصل میں رائے عامہ کے احترام اور ایک دوسرے کی شخصی آزادی میں عدم مداخلت سے عبارت ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اگر کسی ملک میں بے دین اور بدتہذیب لوگ رائے عامہ کے ذریعہ برسرِ اقتدار آجائیں تو سیکولرزم کا تقاضا سمجھا جاتا ہے کہ ان کے اقتدار کو قبول کیا جائے، لیکن اگر ترکی اور الجزائر میں رائے عامہ اسلام پسند حلقوں کے حق میں ہے تو رائے عامہ کو پس پشت ڈال دینا اور فوجی دہشت گردی کو ان پر مسلط کر دینا سیکولرزم ہے۔ گویا کہ رائے عامہ کی پاسداری بھی سیکولرزم اور رائے عامہ کا قتل بھی سیکولرزم۔ سیکولرزم کا یہ وہ معیار ہے جو آتا ترک مصطفیٰ کمال پاشا نے قائم کیا ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس شخص نے اسلام کو جو نقصان پہنچایا ہے، اسلامی تاریخ میں شاید ہی کسی منافق نے بھی اسلام کے ساتھ ایسی جفاکشی روا رکھی ہو، فعلیہ ما علیہ۔

بہرحال مجھے یہ خبر سن کر بے ساختہ اکبر الہ آبادی کا وہ شعر یاد آیا کہ

ایک روز چند بیبیاں آئیں جو بے پردہ
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا!

اکبر نے جو بات کہی ہے وہ ایک حقیقت ہے کہ پردہ کی مخالفت کو کور عقلی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے لئے اس دنیا میں دولت اور عورت کو سب سے زیادہ پرکشش بنایا گیا ہے، سارے جرائم کے دفاتر ملاحظہ کیجئے اور ان کے محرکات کا جائزہ لیجئے تو پچانوے فیصد جرائم کے پیچھے یہی حصولِ زر اور حصولِ زن کا جذبہ

کارفرما ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عورتیں، مقابلہ مال و دولت کے زیادہ اس کا باعث
بنتی ہیں، بلکہ اکثر اوقات زر کو زن پر نثار کیا جاتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ مال و اسباب کو
چھپانے اور نظر بد سے بچانے کیا کچھ جتن نہیں کئے جاتے. تجوریوں کی عالیشان اور مستحکم
عمارتیں اسی لئے تو ہیں؟ رقم کی معمولی مقدار کے لئے بھی کیا مخفی جیبیں نہیں رکھی
جاتیں، اور مضبوط تالے نہیں لگائے جاتے؟ ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہو تو رقم رکھنے
کے بجائے چیک اور ڈرافٹ لے جائے جاتے ہیں، کسی قدر ان کی حفاظت اور صیانت کا
انتظام کیا جاتا ہے کہ کوئی ہاتھ وہاں تک پہونچنے نہ پائے کوئی نگاہ دیکھنے نہ پائے، یہاں تک
کوشش کی جاتی ہے کہ کسی مسافر کے خیال میں بھی یہ بات نہ آئے کہ آپ کے پاس اتنی رقم
موجود ہے؟

تو عورت کے وجود اور اس کی عزت و آبرو کے مقابلے بے قیمت مال و اسباب کے تحفظ
کی اتنی کوششیں اور ان کو نگاہ حرص سے بچا کر رکھنے کا اتنا خیال! لیکن عورتیں جو عزت و ناموس
کا آبگینہ ہیں، اور جن کے آئینہ عفت پر ایک بال بھی انسان کی فطرت سلیمہ کو گوارا نہیں،
ان کو بے پردہ رکھنا کہ سر اور بازو کھلے ہوں، آنکھیں نظر آتی ہوں، سینہ و پشت سے لوگوں کی
نگاہیں ٹکراتی ہوں، کیا شرافت کی بات ہے؟ اور شرافت کو تو جانے دیں، کہ مغربی تہذیب
نے اپنی لغت سے اس لفظ کو خارج کر کے رکھ دیا ہے. کیا عقل اور انسانی فطرت بھی اس کو قبول
کرتی ہے؟

نظر ہی فتنوں کا حرف آغاز ہے، کہ پہلے نگاہ پڑتی ہے پھر آنکھوں سے آنکھیں لڑتی
ہیں، اس کے بعد تو دل بھی اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے۔ پھر تدریجاً عشق و عاشقی کے دلدل
میں انسان پھنستا چلا جاتا ہے، اور اس کا زیادہ نقصان عورتوں کو اٹھانا پڑتا ہے، اسے سماج میں
ذلیل و رسوا ہونا پڑتا ہے، اسے بے باپ کی اولاد کو جننا پڑتا ہے، پھر وہ گناہوں کے جال
میں اس طرح پھنستی چلی جاتی ہے کہ چاہتے ہوئے بھی اس دلدل سے باہر آنا اس کے لئے ممکن
نہیں ہوتا اور وہ ہر نگاہ ہوس کی آسودگی کا سامان بنی رہتی ہے، پس پردہ عورتوں کے لئے قید
ہے اور نہ ان کی تذلیل، بلکہ یہ ان کی حفاظت و صیانت کا ایک انتظام ہے۔

مذہب اور شریعت کے علاوہ خود قانون فطرت بھی ہمیں اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ جو چیزیں عام، غیر اہم اور کشش سے خالی ہوں ان کے لئے حفاظت وصیانت کا اہتمام درکار نہیں، اور جو چیزیں قیمتی، اہم اور پرکشش ہوں، ان کی حفاظت کے لئے قدرتی تدبیریں موجود ہیں، پتھر کی چٹانیں کھلی اور بے غبار حالت میں ہر جگہ مل جائیں گی، لیکن سونے کی کان پتھر کی طرح کھلے عام دستیاب نہیں، بلکہ یہی پتھر اور دوسرے زمینی اجزاء کے تہہ در تہہ غلاف میں سونے کے ذرات چھپا کر رکھے گئے ہیں، ان کی تلاش بھی مشکل ہے، اور تلاش کے بعد ان کو کشید کرنا بھی دشوار، پانی میں سیپ اور اس جیسی کتنی ہی چیزیں تالابوں، ندیوں اور دریاؤں کے کنارے وافر مقدار میں دستیاب ہیں، لیکن موتی کو صدف کے مضبوط غلاف میں چھپا کر رکھا گیا ہے، جو تلاش بسیار کے بغیر ہاتھ نہیں آتا، عورت کا وجود بھی یقیناً ایک پرکشش وجود ہے، جو تاریخ میں بعض بڑی بڑی لڑائیوں کا باعث بنا ہے، تو کیا ان کی حفاظت وصیانت مطلوب نہیں اور ان کو سماج کے رحم وکرم پر چھوڑنا جرم نہیں؟

یہ بات کہ پردہ ترقی کے لئے رکاوٹ ہے، ایک انتہائی فرسودہ اور خلاف واقعہ بات ہے کہ نہ عقل اس کی تصدیق کرتی ہے، اور نہ تجربہ، غور کرو کہ علم کی بنیادی طور پر دو ذریعے ہیں: ایک انسان کی عقل ہے جس کا مرکز دماغ ہے، اور دوسرے انسان میں کسی محسوس کرنے کی صلاحیتیں ہیں یعنی آنکھ جو دیکھتی ہے، کان جو سنتا ہے، زبان جو چکھتی ہے، ناک جو سونگھ کر کسی چیز کو محسوس کرتی ہے، اور ہاتھ یا دوسرے اعضاء جو چھو کر کسی چیز کی سختی اور نرمی کو جانتے ہیں، ان ہی پانچ صلاحیتوں کو فلسفہ کی اصطلاح میں "حواس خمسہ" کہا جاتا ہے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا پردہ ان میں سے کسی صلاحیت کو متاثر کر دیتا ہے؟ کیا پردے کی وجہ سے عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے؟ اور انسان کی یہ صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ پردہ کو علمی وفکری ترقی میں رکاوٹ تصور کیا جائے۔

ہاں پردہ ضرور رکاوٹ ہے، بے حیائی اور بے غیرتی میں اس بات میں کہ عورتیں اپنی عفت وعصمت کو قربان کر کے کلبوں کی زینت بنیں، وہ اجنبی مردوں سے ہم دوش

عبادت گاہوں کا احترام اور اسلام

خدا کی پہچان اور اس کی محبت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے، موحد ہو یا مشرک، خدا کی صحیح پہچان رکھتا ہو یا حقیقی معرفت سے بے بہرہ ہو، خالق کا پرستار ہو یا خالق کو مخلوق کے قالب میں تلاش کرتا ہو، اور شجر و حجر، آگ پانی کی پوجا کرتا ہو، سب کی جبیں خدا کی محبت ہی کو ڈھونڈتی ہے، آتش پرست آتش کدے کیوں سلگاتے ہیں؟ انسان اپنے ہاتھوں سے رنگ برنگ کی خوبصورت مورتیاں کیوں بناتا ہے؟ گرجا گھروں میں ناقوس کیوں بجائے جاتے ہیں؟ یہود اپنی عبادت گاہوں میں گھنٹے تک کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟ مسجدوں میں اذانیں کس کی طرف پکارنے کے لئے دی جاتی ہیں؟ —— یہ سب خدا کی محبت اور اس کی چاہت کے مظاہر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر قوموں نے خدا کی حقیقی پہچان کو کھو دیا ہے، اور انھوں نے منزل کے بجائے راستہ اور خالق کے بجائے مخلوق ہی کو اپنا مقصود بنا لیا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ دنیا میں اسی لئے تشریف لائے کہ انسانیت کو اس کے حقیقی خالق و مالک کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور زندگی کے صحیح طریقوں کے ساتھ ساتھ خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ انسان کو بتایا جائے، لیکن بہرحال مختلف قوموں میں عبادت کے جو طریقے مروج ہیں، وہ درحقیقت انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی آواز ہے، خدا کی محبت، خدا کی چاہت، خدا کو پانے کا شوق، خدا کو اپنے آپ سے راضی کرنے کا جذبہ، خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی کو جھکانا اور اس کے حضور اپنی ضرورت و احتیاج کے ہاتھ اٹھانا، مانگنا، رونا اور گڑگڑانا، یہ سب انسانی فطرت کا حصہ ہے، اور یہ بجائے خود خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

خدا ہر جگہ ہے، اور ہر جگہ پر اس کی حکمرانی ہے، لیکن خدا کی جو عظمت اور جلالت

شان انسان کے قلب و ذہن سے وابستگی ہے، اس کے تقاضا سے آدمی چاہتا ہے کہ خدا کی بندگی اور اس سے سرگوشی کے لئے پاک صاف جگہ ہو، جہاں سکون ہو، جہاں انسان کی روحانیت دنیاوی آلائشوں سے آزاد رہ سکے اور وہ گھڑی چند گھڑی خدا کے حضور یکسو ہو سکے، اسی مقصد کے تحت ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر علاقہ میں عبادت گاہوں کی تعمیر کا ذوق رہا ہے۔ اس سلسلہ کا آغاز کس عبادت گاہ سے ہوا؟ اس کا جاننا بہت دشوار ہوتا، اگر خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے بارے میں نہ بتایا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ سب سے پہلے جو گھر اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ ''کعبۃ اللہ'' ہے، جو مکہ میں تعمیر کیا گیا، قرآن مجید میں کعبہ کی تعمیر ابراہیمی کا صراحتاً ذکر موجود ہے، لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام یا ان سے بھی پہلے فرشتوں نے خدا کے اس گھر کو تعمیر کیا تھا، یہ عبادت گاہ توحید کا مرکز تھی اور ہے، اور ان شاء اللہ قیامت تک رہے گی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قریب دو ڈھائی سو سال پہلے سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اکیس سال بعد تک یہ مرکز توحید بت کدہ بنا رہا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس گھر کی بے حرمتی نہیں فرمائی، مکہ فتح ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بت صاف کر دیئے، اور اس کو اپنی اصل وضع پر لے آئے، لیکن اس کے در و دیوار سے ایک اینٹ بھی نہ کھینچی گئی، اور حالانکہ اس کی تعمیر بنا، ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تھی، پھر بھی اس کی توقیر و اکرام میں کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عبادت گاہیں کس قدر قابلِ احترام اور لائق رعایت ہیں۔

جب بیت المقدس کا علاقہ فتح ہوا تو صورت حال یہ تھی کہ مقام صخرہ کو عیسائیوں نے کوڑا کرکٹ اور نجاستیں پھینکنے کی جگہ بنا رکھا تھا، اور یہ یہودیوں کی عداوت کی بنا پر تھا، کیوں کہ یہودی اس کو اپنا قبلہ مانتے تھے، حد یہ ہے کہ عورتیں اپنے ناپاکی کے کپڑے یہاں ڈالتی تھیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس پہنچے اور مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھی تو ''صخرہ'' پر جو مٹی اور گندگی جمع تھی، اسے اپنی چادر اور قبا مبارک کے دامن میں رکھ کر منتقل کرنا شروع کیا، اس طرح تمام مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس مقام کو گندگی سے صاف کیا۔

عیسائیوں کا یہ عمل دراصل یہودیوں کے ردِ عمل میں تھا، کیونکہ جس مقام پر حضرت عیسیٰ کو عیسائی عقیدہ کے مطابق سولی دی گئی تھی، اس مقام پر یہود سڑی گلی چیزیں پھینکا کرتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ: ۷/۵۶)

رسول اللہ ﷺ نے مذہبی جذبات کی رعایت اور عبادت گاہوں کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، آپ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ فرمایا اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ نہ کوئی چرچ منہدم کیا جائے گا اور نہ کسی مذہبی رہنما کو نکالا جائے گا۔ لا يهدم لهم بيعة ولا يخرج لهم قس، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) بعض مورخین نے معاہدہ نجران میں یہ دفعات بھی نقل کی ہیں کہ پادریوں، راہبوں اور پجاریوں کو اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کیا جائے گا، اور نہ صلیبیں اور مورتیاں توڑی جائیں گی۔

(مقالات شبلی ۱/۸۹، بحوالہ فتوح البلدان: ص ۶۵)

شام کا علاقہ فتح ہوا تو حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور دو اور صحابیان کی گواہی کے ساتھ دستاویز تحریر فرمائی، جس میں نام بنام چودہ گرجوں کا ذکر فرمایا، اور اس کی حفاظت کی تحریری ضمانت دی۔ (البدایہ والنہایہ ۷/۳۷)۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مصر کے موقع سے بھی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے گرجوں کی حفاظت کے سلسلہ میں دستاویزی معاہدہ کیا تھا، اور ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنی عبادت گاہوں کے اندر جس طرح چاہیں عبادت کریں اور جو کہنا چاہیں کہیں: ان يخلى بينهم وبين كنائسهم يقولون فيها ما بدا لهم (مجمع الزوائد ۶/۵۰، بحوالہ طبرانی کبیر)

مسلمانوں کو ہمیشہ عبادت گاہوں کا احترام ملحوظ رہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب دمشق کی جامع مسجد میں یوحنا کے نام سے موسوم گرجا کو شامل کرنے کی کوشش کی اور عیسائی اس پر راضی نہ ہوئے تو آپ اس سے باز رہے، لیکن عبدالملک بن مروان نے بجبر اس کو مسجد میں شامل کرلیا، پھر خلیفہ عادل و راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں عیسائیوں نے فریاد کی اور اس کا حوالہ دیا، چنانچہ حضرت عمر نے دمشق کے گورنر کے نام حکم جاری فرمایا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملایا گیا ہے وہ انہیں واپس کردیا جائے، آخر مسلمانوں نے

عیسائیوں کی خوشامد نہیں کرتے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا، اور اس طرح یہ صلح باقی رہ سکی۔
(فتوح البلدان ۱۳۱)

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں غیر مسلم اقلیتوں کو نہ صرف اپنی قدیم عبادت گاہوں کو باقی رکھنے کا حق تھا، بلکہ نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی بھی اجازت تھی، مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> خود عیسائیوں کو اپنی آبادی میں گرجا بنانے کی ممانعت نہ تھی، چنانچہ جب فسطاطِ مصر میں عیسائیوں نے ایک نیا گرجا بنایا، اور فوج نے اس کی مخالفت کی تو حضرت مسلمہ بن مخلد نے یہ استدلال کیا کہ یہ تمہاری آبادی سے باہر ہے اور اس پر تمام فوج نے سکوت اختیار کیا۔ (حسن المحاضرہ ۲) ــــ ہارون رشید کے زمانۂ خلافت میں مصر کے گورنر عامر بن عمر نے جب عیسائیوں کو گرجوں کے بنانے کی عام اجازت دینا چاہی تو لیث بن سعد اور عبداللہ بن لہیعہ سے مشورہ لیا، ان بزرگوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ مصر کے تمام گرجے صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ (ولاۃ مصر: ۱۳۲)

مسلمانوں نے نہ صرف مذہبی عبادت گاہوں کو قائم رکھا اور ان کی تعمیر کی اجازت دی بلکہ عبادت گاہوں کے اوقاف، عہدے اور ان کے وظیفے بھی برقرار رکھے علامہ شبلی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جس قدر اراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں، اسی طرح بحال رہنے دیں، چنانچہ اس قسم کی جو اراضیات ۵۰۷ھ تک موجود تھیں ان کی مقدار ۲۵ ہزار فدان تھی۔ (مقالاتِ شبلی ۲۰۳)

علامہ شبلی نے آگے لکھا ہے:

> "حضرت عثمان کے زمانہ میں مرہ کا جو بڑا پادری تھا، اور جس کا

زنا کی سزا — موجودہ سماجی ماحول میں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس طور پر بسایا ہے کہ اس میں انسان کی خواہش کے ایک ایک سامان ہیں، لذیذ سے لذیذ غذا ہے، عمدہ سے عمدہ پانی ہے، آنکھوں کو بھانے والے رنگ برنگ کے پھول ہیں، دل کو رجھانے والے آبشار اور جھیلیں ہیں، حسین سے حسین تر انسان ہے کہ جلی ہوئی جس کے اسیر زلف ہو کر رہ جاتے ہیں، اور کتنی ہی نعمتیں ہیں جن سے انسان کی طرح طرح کی خواہشات متعلق ہیں! لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مفادات وخواہشات اور چاہتوں میں تصادم کی کیفیت رکھی ہے، چیز ایک ہے لیکن طلب گار کئی ہیں، خواہش کسی ایک ہی کی پوری کی جا سکتی ہے، لیکن کتنی ہی خواہشات ہیں جو اس ایک شئی سے متعلق ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا، آخرت کی دنیا میں خواہشات بھی ہوں گی اور ہر خواہش کی تکمیل بھی، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اتنی وافر مقدار میں ہوں گی اور اتنی یکسانیت کے ساتھ دستیاب ہوں گی کہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوگا، اور سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ گو جنت میں بھی درجات ومراتب کا فرق ہوگا لیکن ہر شخص کو یوں محسوس ہوگا کہ وہی سب سے بہتر حالت میں ہے، یہ احساس اس کے قلب کو پُر سکون رکھے گا، اور احساس محرومی کا کوئی سایہ بھی اس کے سر سے نہ گذرے گا، جنت میں رہنے والوں کے درمیان نہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ ہوگا، نہ باہمی نفرت وعداوت، اور اسی لئے وہاں جرم کا کوئی محرک بھی نہ ہوگا۔

اس دنیا میں چوں کہ انسان تصادم اور مسابقت کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، یہی ٹکراؤ نفرت وعداوت اور مخالفت کو جنم دیتی ہے، کچھ لوگ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور مفادات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ محروم وناکام، جو محروم

مجرم کو معاف کرنے کا مجاز نہیں، اسلام کے نظامِ جرم و سزا میں دوسری اہم چیز "قصاص و دیت" ہے، یہ قتل اور جزوی جسمانی مضرت رسانی سے متعلق ہے، ان جرم کو بندوں کے حقوق سے متعلق قرار دیا گیا، اس لئے صاحب معاملہ یا اس کے اولیاء مجرم کو معاف کر سکتے ہیں، اور مال کی کسی مخصوص مقدار پر صلح بھی کر سکتے ہیں، ان کے علاوہ جو جرائم ہیں ان کی بابت، عدالت اپنی صوابدید سے سزا کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور ملک کی پارلیامنٹ کے لئے بھی ایسے جرائم کے بارے میں قانون سازی کی گنجائش ہے، ان جرائم سے متعلق سزا کو فقہ کی اصطلاح میں "تعزیر" کہا جاتا ہے۔

گناہ سے باز رکھنے کا تیسرا سبب سب سے اہم اور سب سے زیادہ مؤثر محرک آخرت کی جوابدہی کا احساس ہے، قانون دن کے اجالے میں انسان کے ہاتھ تھام سکتا ہے، لیکن رات کے اندھیروں اور انسان کے خلوت کدوں تک نہیں پہنچ سکتا، آخرت کی جوابدہی کا احساس ہی ایسی طاقت ہے جو انسان کو اپنی تنہائیوں میں بھی جرم سے باز رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت مجرمانہ ہو اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو تو کوئی طاقت نہیں جو اس کو جرم سے روک سکے، وہ اپنی سیاہ کاریوں کے لئے ہزار تدبیریں نکال لے گا اور نئے نئے راستے تلاش کرے گا، اسی لئے قرآن مجید نے جہاں کسی بات سے منع کیا ہے وہاں خوف خداوندی اور آخرت کی جوابدہی کی طرف توجہ فرمائی ہے۔

زنا اسلامی نقطۂ نظر سے "حدود" میں شامل ہے، غیر شادی شدہ مردوں کے لئے اس کی سزا سو کوڑے ہے، اور شادی شدہ کے لئے سنگسار کرنا، ظاہر ہے کہ یہ نہایت سخت سزا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کے نقصانات بھی بہت شدید ہیں، زنا نہ صرف انسانی اخلاق کو تاراج کرنے اور مذہبی قدروں کو پامال کرنے کے مترادف ہے، بلکہ یہ ایک پورے خاندان کے عزت و آبرو سے کھیلنا اور اس پر ننگ و عار کا ٹیکہ لگانا ہے، جب ایک مرد کسی عورت سے بدکاری کرتا ہے تو یہ فعل عورت کے پورے خاندان کے لئے سماجی اعتبار سے بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے، اور اصحابِ شرافت کے یہاں خود اس مرد کے خاندان کے لئے بھی یہ چیز کچھ کم باعث عار نہیں ہوتی، زنا کا سب سے زیادہ نقصان پیدا ہونے

والے بچے کو پہونچتا ہے، وہ باپ سے محروم رہتا ہے، باپ سے محرومی نہ صرف اس کو اپنی شناخت اور میراث سے محروم کرتی ہے بلکہ قانونی طور پر اس کے اخراجات کا کوئی کفیل بھی باقی نہیں رہتا، اگر کنواری لڑکی کے ساتھ دست درازی کی گئی ہو تو اس کے کنوارپن کا ضائع ہو جانا ایسا نقصان ہے جس کی کسی طور تلافی ممکن نہیں، اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو یہ اس کے شوہر کے ساتھ بھی زیادتی ہے، کہ اس سے اس کی عزت و آبرو کو صدمہ پہونچنے کے علاوہ قریبی زمانہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب بھی مشکوک ہو جاتا ہے، اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا نہایت سخت مقرر کی ہے۔

اسلام نے اس نوع کے جرائم میں جسمانی سزا مقرر کی ہے، کیونکہ تجربہ ہے کہ جسمانی سزا مجرم پر جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے محض قید سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا، بلکہ اعداد و شمار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مجرمین کو جیل بھیجا گیا ہے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ یکجائی کی وجہ سے ان کے جرم کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے، ۱۹۶۰ء میں مصر میں جرائم کے اعداد و شمار کے مطابق اس سال چوری کے ۱۸۳ کیس ہوئے، ان میں صرف ۵۵ کیس ایسے تھے جن میں مجرم کو پہلی بار یہ سزا مل رہی تھی، باقی تمام مجرمین وہ تھے جو ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ دفعہ چوری کی سزا میں جیل جا چکے تھے اور ان میں غالب تعداد ان مجرمین کی تھی جو تین بار سے زیادہ جیل کے چکر لگا چکے تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مجرم نے جتنی سزا پائی اور جتنی بار جیل گیا اپنے ہم پیشہ مجرمین کی صحبت سے اس کے جذبۂ جرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس کے برخلاف جسمانی سزائیں جرم کو روکنے میں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں، سعودی عرب میں ۲۵ برس تک چوری کے صرف ۱۲۰ ایسے واقعات ہوئے تھے، جن میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، لیبیا میں بھی ایک زمانہ میں قانون شریعت کا نفاذ عمل میں آیا تھا تو تین سال میں صرف چھ مجرمین کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ جسمانی سزائیں قتل وغیرہ کی جرم کو روکنے میں جس درجہ موثر ہیں محض قید کی سزا اس درجہ اس مسئلہ کے باب میں مفید نہیں۔

جبری زنا کے سلسلہ میں اس وقت ایک بحث چھڑی ہوئی ہے، ہمارے وزیر اعظم

شری لال کرشن اڈوانی اور ریاست کے چیف منسٹر جناب چندرا بابو نائیڈو دونوں کا رجحان ہے کہ اس جرم کی سزا پھانسی ہونی چاہئے، بعض تنظیموں نے اس کی مخالفت کی ہے، اور بعض مسلم تنظیموں اور شخصیتوں نے اس کی تائید کی ہے، غالباً اس لئے کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے قریب ہے، لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں، اور کئی نکات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ اسلام جب بھی کسی جرم پر سخت سزا متعین کرتا ہے تو اس جرم کو روکنے کے لئے مناسب ماحول بھی تیار کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جرم کے محرکات اور عوامل کو کم سے کم کر دیا جائے ـ مثلاً یہی زنا کی سزا ہے، تو اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے شریعت نے پردہ کے احکام رکھے، محرم اور غیر محرم کے اختلاط کو منع کیا، دفاتر ہوں یا تعلیم گاہیں، یا سواریاں، ہر جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے اختلاط کی ممانعت ہے، شراب کو حرام قرار دیا گیا، کیوں کہ نشہ شہوانی تقاضوں کو بے قابو کرنے والی چیز ہے، عورتوں کو برسرعام اپنی زیبائش و آرائش کے اظہار سے روکا گیا، دیدہ زیب، چست اور پرکشش لباس پہن کر باہر نکلنے کی ممانعت فرمائی گئی، کیوں کہ یہ چیزیں انسانی ہوس کو راستہ دکھاتی ہیں، پھر اس ماحول میں زنا کی سخت ترین سزا رکھی گئی ـ دوسرے جو جرم جتنا شدید ہے اس کے لئے قانونِ شہادت کو بھی اسی قدر سخت بنایا گیا، زنا کے لئے چار عینی مرد گواہوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی، بشرطیکہ مجرم کو خود اقرار نہ ہو ـ

ہندوستان میں اول تو جرم کے محرکات کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، فحش فلموں کا بازار گرم ہے، عریاں ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں، ٹی، وی نے حیا کی چادر تار تار کر دی ہے، فحش لٹریچر کا سیلاب ہے، بے شرمی پر مبنی مشتہرات تو بچے بچے کی زبان پر ہیں، بے پردگی اور عریانیت نے پورے ماحول کو مسموم بنا دیا ہے، تعلیم گاہوں سے لے کر دفاتر تک مخلوط نظام کو اپنی ترقی کی علامت تصور کیا جاتا ہے، شراب عام ہے، اور ایک طبقہ کو زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں، بلکہ غیر شادی شدہ عورتوں سے باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے تو قانون کی نظر میں وہ زنا ہے ہی نہیں، پھر قانون شہادت اتنی بے احتیاطی پر مبنی ہے کہ محض ایک شخص کی گواہی پر بھی اہم سے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان حالات میں زنا کی سزا

پھانسی کو قرار دیا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی قرین انصاف بات نہ ہوگی۔ اسی لئے فقہاء نے حدود شرعیہ کے جاری ہونے کے لئے "دارالاسلام" کی شرط لگائی ہے۔ زانی بے شک سخت ترین سزا کا مستحق ہے، لیکن تقاضۂ انصاف یہ ہے کہ اس کو جرم سے بچنے کا ماحول دیا جائے، جو ماحول قدم قدم پر گناہ کی دعوت دیتا ہو، اس ماحول میں مجرم کو اس طرح کی سزا دیا جانا یقیناً محل نظر ہے۔ اس لئے حکومت کو چاہئے کہ پہلے ایسے قوانین بنائے جو جرم کے عوامل اور محرکات کو روک سکے، اور ایسے پاکیزہ سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں انسان گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانے میں سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہو، پھر زنا کی قرار واقعی سزا مقرر کرے!

(۱۵ دسمبر ۱۹۹۹ء)

ذبحِ حیوان ـــــ حقائق اور غلط فہمیاں

ادھر چند سالوں سے جیسے بقرعید آتی ہے، فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آجاتی ہیں اور گاؤ کشی اور جیو ہتیا کے خلاف بیانات شروع ہو جاتے ہیں، بلکہ قربانی کے خلاف ایک مہم سی چلائی جاتی ہے۔ اس سال چوں کہ امروزی الحجہ کو ہی "جین جینتی" بھی تھی، اس لئے اس مسئلہ کو ضرورت سے زیادہ طول دینے کی کوشش کی گئی، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ مرکز میں بی۔ جے۔ پی حکومت ہے، گویا چور خود چوکیدار ہے، اس لئے فساد کی آگ سلگنے نہ پائی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی غذا کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا نہ مذہب کے خلاف ہے اور نہ بے رحمی ہے، بلکہ یہ ایک فطری ضرورت ہے اور اس سے بہت سے غریبوں کے معاشی مفادات متعلق ہیں، جس کو نظر انداز کر دینا کسی بھی طرح قرینِ انصاف نہیں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلم برادرانِ وطن غیر جذباتی ہو کر ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ جذباتی اشتعال کے بجائے دلیل کی زبان میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو سمجھائیں اور ان کو قائل کریں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے۔ اس سلسلہ میں اول تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی سوائے "جین مذہب" کے حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے۔ آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ

محض اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت ہے۔ خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے، پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے۔ رگ وید میں ہے:

اے اندر! تمہارے لئے پوشان اور وشنو ایک سو بھینس پکائیں۔ (رگ وید ۶، ۱۷، ۱۱)

یجروید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گائیوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (یجروید ادھیائے ۲۰:۷۸) منوسمرتی میں کہا گیا ہے:

مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑیے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔ (منوسمرتی۔ ادھیائے ۳، ۲۶۸)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانے تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تارا چند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ گوشت کے انسانی غذا ہونے اور اس مقصد کے لئے ذبح حیوان کے جائز ہونے پر نہ صرف یہ کہ مذاہب عالم متفق ہیں، بلکہ تقاضۂ فطرت کے تحت اور عقلی طور پر بھی اس کا حلال ہونا ضروری ہے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنا ہے یعنی یہ "جیو ہتیا" کا باعث بنتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو اس بات کا سمجھنا دشوار نہیں کہ کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کمتر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ مخلوق کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے۔ غور کرو تو کیا اس جیو ہتیا سے بچ سکنا ممکن بھی ہے؟ آپ جب پانی یا دودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اتارتے ہیں، تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبانِ حال سے پروانۂ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں جاکر کیا کام کرتے ہیں؟ یہی کہ جو مضر صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں اور چھپے بیٹھے ہوں، ان کا خاتمہ کردیں، اگر "جیو ہتیا" کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لئے روا ہو سکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں۔ خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے۔ سوامی دیانند جی نے "آواگمن" میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں: انسان، حیوان اور نباتات، یہ نباتات میں زندگی کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہے تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، گویا اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو محض خود کو جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہتے ہوں۔

پھر انسانی خوراک کا جو حصہ جانوروں سے پورا ہوتا ہے، بعض بہت ٹھنڈے یا بہت گرم صحرائی علاقے تو ہیں کہ وہاں کھیتی نہیں کی جا سکتی، وہاں گوشت ہی انسانی غذا کے کام آتی ہیں، پھر خود جسم انسانی میں بعض ایسے عناصر ہیں کہ ان کی کمی کو بغیر گوشت کے پورا نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ جانور ایک عمر کو پہنچ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں، نہ ان سے دودھ حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ کسی اور کام آ سکتے ہیں، ایسی صورت میں اگر آپ ان کو غذا بنانے کی اجازت نہ دیں تو مویشی کی پرورش کرنے والوں کے لئے وہ بہت بوجھ بن جائیں گے اور غریب کسان جو خود اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے وہ کیوں کر اس بوجھ کو برداشت کر سکیں گے؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ گاؤ کشی وغیرہ کی ممانعت ہم مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے۔ بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے، جانور اگر ذبح نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دودھ اور گھی سستے قیمتوں میں فراہم ہوں گے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا، لیکن یہ محض ایک واہمہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں ہندوستان سے زیادہ جانور ذبح ہوتے ہیں اور جہاں جانوروں کے ذبح پر کسی قسم کی پابندی نہیں، وہاں بہ مقابلہ ہمارے ملک کے گھی اور دودھ سستے بھی ہیں اور ان کی فراوانی بھی ہے۔ اس کی مثال امریکہ اور یورپ ہیں۔ ہمارے ملک میں باوجودیکہ بہت سے علاقوں میں ذبح گاؤ پر پابندی ہے اور عام جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی خاصی تحدیدات ہیں، لیکن اس کے باوجود یہاں دودھ گھی زیادہ مہنگے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج دنیا کے متعدد ترقی یافتہ ممالک جانوروں کی افزائش نسل کرکے بڑے پیمانے پر ان کے گوشت برآمد کرتے ہیں اور اس طرح وہ کثیر اقتصادی منافع حاصل کرتے ہیں، اگر ہمارے ملک میں اس پر روک لگادی گئی تو یہ ملک وقوم کو گوشت اور چمڑے وغیرہ کی برآمدات کے ذریعہ حاصل ہونے والی کثیر آمدنی میں شدید خسارہ کا باعث ہوگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گوشت خوری سے انسان میں تشدد اور اشتعال کا مزاج بنتا ہے اور یہ انسان پر منفی اخلاقی اثر ڈالتا ہے، لیکن دنیا کی تاریخ اور خود ہمارے ملک کا موجودہ ماحول اس کی تردید کرتا ہے۔ آج ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے میرٹھ اور بھاگلپور میں ظلم وستم کا ننگا ناچ کیا ہے، وہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے جو سبزی خور ہیں اور گوشت خوری کے مخالف ہیں۔ رہنمایان عالم میں شری گوتم بدھ اور حضرت مسیح کو عدم تشدد اور رحم دلی کا سب سے بڑا داعی اور نقیب تصور کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ برگزیدہ شخصیتیں گوشت نہیں کھاتی تھیں، یہ بھی گوشت خور تھے۔ گوتم بدھ نہ صرف گوشت خور تھے بلکہ دم آخر میں بھی گوشت کھا کر ہی ان کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بھی بڑھ کر کوئی تشدد، جور وستم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا، اس لئے یہ سمجھنا کہ جذبات اور اشتعال کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، بے وقوفی اور ناسمجھی ہی کہی جاسکتی ہے۔ جب تک دلوں کی دنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جوابدہی کا احساس نہ ہو تو محض غذائیں انسان کے مزاج و مذاق کو تبدیل نہیں کرسکتیں۔

(۳؍ اپریل ۱۹۹۹ء)

قانون شریعت، رحمت نہ کہ زحمت

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اور ان کی ضروریات سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں، وہ شیر خوار بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انہیں مشکل محسوس نہیں ہوتی، یہ تو خیر انسان ہیں، جانور اور حیوانات، جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کا اشارہ کی بھی زبان نہیں ہوتی، ان کے مالک اور پرورش کرنے والے بھی ان کی ضرورت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کائنات کے خالق و مالک اس ہستی سے بڑھ کر جس نے تمام نظام کائنات کا موجد "حضرت انسان" کی ضروریات، جذبات، مصالح و مفاسد اور عادات و اطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا؟ اس لئے خود خالق کائنات انسان کے لئے جتنا بہتر اور مناسب تمدنی اور معاشرتی قانون حیات وضع کرسکتا ہے، یقیناً کوئی اور طاقت نہیں کرسکتی، پھر نظام زندگی کو مرتب کرنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں، اور اس کے لئے قوت فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے: "الا له الحکم" (انعام: ۶۲)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے، سونے جاگنے اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظام زندگی کے بارے میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں رکھا، کیونکہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کی ضروریات، فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے اس بات کی امید کی جاسکتی ہے کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے بحیثیت انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور

انصاف سے کام لے سکے گا، اسی لئے خدا نے جو رب اور رحمن و رحیم ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گزارنے اور جینے اور مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں اللہ کے نبی و رسول آتے رہے، حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہو گیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے جو قانون بھیجا جاتا رہا، اسی کو "شریعت" کہتے ہیں، انسان کا ابتدائی دور بچپن کی سی اور تمدنی ناپختگی کا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام ﷺ اس عہد میں تشریف لائے، جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال و پختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا، اس لئے آپ کو وہ احکام دیئے گئے، جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں جو نشوونما جاری رہتی ہے اور سال دو سال پر اس کے کپڑے تنگ ہوتے جاتے ہیں، لیکن جب آدمی پوری طرح جوان ہو جاتا ہے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلواتا ہے، آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے، اسی طرح شریعت محمدی اس وقت دنیا میں آئی، جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آگئی، اسی لئے یہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا، قرآن کی زبان میں اسی کا نام "اکمالِ دین" اور "اتمامِ نعمت" ہے۔ (مائدہ: ۳)

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظامِ حیات ہے، جو "شریعتِ الٰہی" یا "اسلامی قانون" کہلاتا ہے، یہ قانون فلاسفۂ یونان کے افکار کی طرح محض "نظریہ" نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر بھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظامِ زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی معمولی سی مدت اسے بے نام و نشان کر دے، بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے لگ بھگ ایک ہزار سال ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا

ہے، دنیا میں جب بھی اس قانون کی آزمائش کی گئی، اس کی افادیت، قانونِ فطرت سے مطابقت اور امن و سلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے خلافتِ عثمانیہ ترکی کے سقوط کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا، لیکن آج بھی دنیا کے بعض ملکوں: سعودی عرب، افغانستان، سوڈان اور ایران میں اسلامی قانون کے اطلاق کو کسی حد تک وسعت دی گئی ہے، وہاں لوگ اس کی افادیت کا احساس کر رہے ہیں اور امن و سلامتی کی ٹھنڈی چھاؤں اسلام کی برکت سے ان کو حاصل ہے۔

اسی احساس نے گزشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ایشیا اور افریقہ میں کروٹ لی ہے اور بعض ملکوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کا اتنا شدید دباؤ ہوا جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، وہاں بتدریج ان قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ایران اور سوڈان اس کی مثالیں ہیں، ان دونوں ملکوں کو تو عرصے سے بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیا ہی جا رہا تھا، جب طالبان نے افغانستان میں حیرت انگیز فتوحات پائیں اور ایک ایسے ملک کو، جو خانہ جنگی اور غارت گری کا شکار تھا، امن سے سرفراز کیا اور وہاں کے باشندوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت عرصے کے بعد لاقانونیت اور خانہ جنگی سے امن و امان اور قانون و آئین کی طرف واپس ہوئے ہیں، تو پھر ایک نیا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور ذرائع ابلاغ میں ان کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کے افسانے تراشے جانے لگے۔

ابھی دو تین ہفتے پہلے اچانک وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف نے شریعت بل کا اعلان کیا، جس کے تحت پاکستان میں قرآن و سنت کو سب سے بالاتر قانون تسلیم کیا جائے گا، یہ اعلان کس قدر اخلاص پر مبنی ہے؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے! یہ ملک اسلام ہی کے نام پر بنا اور اسلام ہی کا نام لے کر مختلف حکمرانوں نے اقتدار کی سیڑھیاں طے کیں، لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام بھی ابھی تک محفوظ نہیں، جس کو کسی درجہ ہندوستان میں دستوری تحفظ حاصل ہے، بظاہر اس قسم کا اعلان محض حکمرانوں کی کرسی ہوتی

سا کو دوا ونچا اٹھانے کی ایک تدبیر ہے، تاہم بعض دفعہ شر سے بھی خیر پیدا ہوتا ہے، اگر اس بہانے بھی یہ بل پاس ہو جائے تو ایک خوش آئند بات ہوگی۔

لیکن اس اعلان نے بھی ایک بار مغرب اور مشرق کو چونکا دیا اور بعض لوگ اس طرح اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ گویا کوئی خوفناک زلزلہ یا طوفان آنے والا ہے، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بی جے پی گورنمنٹ، جو خود "رام راج" کا نعرہ لگاتی ہے اور ہندو راشٹر کا خواب دیکھتی ہے، وہ بھی اسے مذہبی بنیاد پرستی کا نام دے رہی ہے، اس طرح کے بیانات سے عام لوگوں میں غلط فہمی کی فضا قائم ہوتی ہے اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ واقعی یہ کوئی "ڈراونی" چیز ہے؛ حالاں کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ ایک اچھی خبر ہے، نہ کہ بری اور انسانیت کے مفاد میں ہے، نہ کہ ان کے لئے نقصان اور پریشانی کا باعث۔

اسلامی شریعت کا اصل امتیاز دو باتیں ہیں: عدل اور اعتدال، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن وامان کا قیام اور اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں گی؛ کیوں کہ وہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، امور خانہ داری کی انجام دہی اور بچوں کی پرورش عورتوں کے ذمہ رہے گی، کیوں کہ وہ ان کاموں کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ حقوق وفرائض کی تعیین میں افراط وتفریط نہ ہو جائے، جیسے یہی خواتین کے حقوق کا مسئلہ ہے، بعض قوموں نے عورتوں کو اس درجہ گرایا کہ ان کو انسانیت کی آخری صف میں بھی جگہ نہیں دی اور بعض نے اتنا اونچا اٹھایا کہ جن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دیں، یہی حال مزدوروں کے معاملہ میں ہوا، کچھ لوگوں نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کا زر خرید غلام بنا دیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ حکمرانی مزدوروں ہی کا حق ہے، اس افراط وتفریط نے ہمیشہ سماج کو نقصان پہنچایا ہے، شریعت اسلامی کا اصل امتیاز یہی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین تقاضۂ عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط وتفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، خود حدود

قصاص کے قوانین، جو جرائم اور سزاؤں سے متعلق ہیں، بنظر انصاف دیکھا جائے تو
نہایت متوازن اور قانون فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے،
اس درمیان دنیا ترقی کی نئی سائنسی، معاشی اور سیاسی تغیرات سے گزر چکی ہے، جو انسان بیل
گاڑیوں پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش پر اڑتا ہے اور سمندر کی تہوں میں غواصی کرتا ہے۔
ایسے فرسودہ عہد کے قوانین اس ترقی یافتہ و متمدن عہد کے لئے کیوں کر کفایت کر سکتے
ہیں؟ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے، دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں: ایک اس
کی فطرت، دوسرے وہ وسائل و ذرائع جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، غور
کیا جائے تو جو کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ ان سب کا تعلق اسباب و وسائل کی دنیا سے ہے،
انسان کی فطرت اور اس کے اندرون میں کوئی تبدیلی نہیں، ہاں ان کے طریقے ضرور بدل
گئے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے، لیکن بھوک و پیاس جیسے پہلے تھی ویسے اب
بھی ہے، انسان نے تلوار اور تیر کی جگہ ایٹم بم اور میزائیل بنا لیا ہے، لیکن اس کے پیچھے جو
جذبۂ انتقام و مدافعت پہلے کارفرما تھا، اب بھی ہے۔ یہی حال زندگی کے تمام شعبوں کا ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے نہ کہ اسباب و وسائل، وہ انسان
کی فطری خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ
طاقت کا استعمال ظلم کو دور کرنے کے لئے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے، وہ کہتا ہے کہ
دولت غریبوں کے گھر چولہا روشن کرنے پر صرف کرو، نہ کہ اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے،
وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی اور فکری قوت انسان کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرے، نہ
کہ انسان کے لئے ہلاکت خیز وسائل کی ایجاد میں، وہ چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا استعمال
سچی حقیقتوں کے اظہار اور سچائی کی مدد کے لئے ہو، نہ کہ جھوٹ پروپیگنڈے اور سچائی کو
دبانے کے لئے، اس لئے جوں جوں وسائل و اسباب کی دنیا میں ترقی ہوتی جائے گی،
اسلامی قانون کی اہمیت اور ضرورت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا
کا کوئی قانون نہیں، جس نے اسلام سے خوشہ چینی نہ کی ہو، خاص کر سول قانون میں تو

اسلامی قانون سے جو فائدہ اٹھایا گیا ہے اس کا شمار نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں کہیں اور جس قدر اسلامی شریعت سے اعراض اور گریز کا راستہ اختیار کیا گیا وہاں اسی قدر وہ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس لئے اسلامی شریعت کا نفاذ ایک رحمت ہے، نہ کہ زحمت، اس سے نہ کسی کو خطرہ ہے اور نہ اس پر دنیا کو اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ اسلام سراپا رحمت اور امن وسلامتی ہے، مسلمانوں کے لئے بھی، مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی اور ان کے پڑوسیوں کے لئے بھی، بشرطیکہ مسلم ممالک اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی زمین پر صرف خدا کی رضا کے لئے قانون شریعت کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ مصلحت اور حکمت کی رعایت کرتے ہوئے نافذ کریں، اگر واقعی انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا، جس سے دنیا سبق لے گی اور بہت سی زبانیں جو کھلے عناد وحسد سے کھلتی ہیں، گنگ ہو جائیں گی!

(۱/۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء)